رضا علی عابدی

اخبار کی راتیں

ایک سفر، صحافت کی پہلی سیڑھی سے بالائی منزل تک

آخر میں زبان کا فن اور مسائلِ تلفظ

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

070 Abdi, Raza Ali
Akhbar Ki Ratain / Raza Ali Abdi
.-Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2020.
191pp.
1. Urdu Literature - Journalism.
I. Title.

2020ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2464-0
ISBN-13: 978-969-35-2464-2

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

شروع

ہمارے ہاں لوگ دور دور کے سفر کر کے وہاں کے حالات لکھتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ قریب کی دنیا کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی اس کا احوال قلم بند نہیں کرتے۔ اپنے اردگرد کی کیفیت کو آنے والے زمانوں کی خاطر محفوظ کرنے کا کوئی رواج نہیں۔

میں نے اپنے جرنیلی سڑک کے سفر سے یہ سیکھا کہ برصغیر کی اس عظیم شاہراہ پر سنہ 1985ء میں زندگی کا انداز کیسا تھا، لوگ کیا کرتے تھے، کیا سوچتے تھے، کیسے رہتے تھے اور کیسے جیتے تھے۔ یہ لکھ کر چھوڑ دیا جائے تو تحریر کا یہ سرمایہ آنے والے نہ صرف برسوں بلکہ صدیوں تک مطالعے کا دلچسپ سامان فراہم کرے گا۔

پرانے وقتوں میں بادشاہ اپنی تزک لکھا کرتے تھے اور اپنے اردگرد کے حالات اور مشاہدات رقم کیا کرتے تھے۔ وہ تحریریں آج تک پڑھی جاتی ہیں۔

میں نے نوجوانی میں صحافت یا میڈیا کی دنیا میں قدم رکھا۔ ظاہر ہے میں اس میدان میں تنہا نہ تھا۔ میرے بہت سے ساتھی تھے جو اہل قلم بھی تھے۔ ان میں دو ایک کے سوا کسی نے اپنے وقت، دور اور حالات کو تحریر کی صورت میں محفوظ نہیں کیا۔ اس میں کسی کا قصور بھی نہیں کیونکہ اس وقت ایسا کوئی چلن بھی نہیں تھا۔

کچھ نامور لوگوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے، کچھ غیر معمولی واقفیت رکھنے والوں نے درونِ خانہ معاملات پر پڑے ہوئے پردے اٹھائے لیکن عام لوگوں نے اپنے ماحول اور اطراف کو قلم بند نہیں کیا۔

میں نے ایک ذراسی مختلف روایت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور اخباری دنیا میں گزارے ہوئے اپنے حالات کو خودنوشت سوانح کے طور پر نہیں لکھا بلکہ ایک مخصوص دور کے ماحول کی قلم کے ذریعے تصویر کشی کی ہے۔

یہ تحریر یوں بھی مختلف ہے کہ اس میں سارا ذکر خود میرا نہیں، میرے آس پاس موجود ساتھیوں، دوستوں اور رفقائے کار کا احوال بھی شامل ہے۔

یہ ایک صحافی کی زندگی کی داستان نہیں بلکہ صحافت کے پیشے کی کہانی ہے، یہ صحافیوں کی زندگی کا آئینہ ہے اور اُن کے روز وشب کا عکس ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے اپنے دوستوں کے حلقے میں بیان کیں تو نہ صرف توجہ سے سنی گئیں بلکہ احباب نے اصرار کیا کہ میں یہ تمام باتیں لکھ ڈالوں۔

خیال برا نہیں تھا۔ ہاتھ میں قلم پہلے روز سے موجود تھا، اُس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ذہن میں وہ بے شمار گزرے ہوئے لمحے سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ منظر ابھی نگاہ میں تھے اور میرے ہمراہ وقت گزارنے والوں کی بے جان نہیں بلکہ چلتی پھرتی تصویریں دماغ کے کسی گوشے میں موجود تھیں۔

ان تمام کیفیتوں کو میں نے بڑا سرمایہ اور گزرے وقتوں کی بڑی سوغات سمجھا، انہیں سمیٹا، یکجا کیا اور کاغذ پر اتار دیا ہے۔

اس تحریر میں جھول بھی ہیں، کہیں کہیں خلا بھی ہے، بعض واقعات چھوٹ گئے ہیں، کچھ شخصیات کا نام تک نہیں آیا ہے، بعض قصوں میں ممکن ہے کچھ مغالطہ ہو، کہیں کہیں مبالغہ بھی ہے اور ممکن ہے کچھ باتوں میں سہو ہو اور گزرتے وقت نے میری یادداشت کے کچھ گوشوں میں دھواں سا بھر دیا ہو۔

اس بھول چوک کا ایک بہت بڑا سبب ہے اور وہ یہ کہ یہ تمام باتیں جو میں نے لکھی ہیں، ان کی تصدیق کے لیے نہ انٹرنیٹ میں کوئی مواد دستیاب ہے، نہ کسی انسائیکلوپیڈیا میں ان کی سند ہے اور نہ کسی گوگل یا فیس بک میں ان کا کوئی حوالہ ہے۔

ہاں۔ اگر کوئی میرا ہاتھ بٹانے والا ہے تو وہ گزرے وقت کے میرے ساتھی اور رفیق ہیں لیکن ان کا حال بھی سن لیجیے۔ میں نے اپنے کیریئر کے ابتدائی تین برس راولپنڈی میں گزارے۔ اب جو لکھنے بیٹھا تو ان برسوں کے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی فہرست ترتیب دینے

لگا۔ ذہن پر زور ڈال کر تمام نام یاد کیے، وہ نام لکھے تو تعداد میں پورے پچاس نکلے اور پورے پچاس سال بعد ان کے پتے ٹھکانے ڈھونڈ نے نکلا تو پتا چلا کہ ان میں سے بمشکل دس زندہ ہیں اور وہ بھی یا تو بے حد ضعیف ہو چکے ہیں یا معلوم نہیں کہاں ہیں۔

خدا بھلا کرے روز نامہ ''نوائے وقت'' کے اُس وقت کے جونیئر رپورٹر شیخ اکرام الحق کا جو خیر سے سلامت ہیں اور رابطے میں ہیں۔ جب میں نے انہیں یہ پچاس ناموں کی فہرست پڑھ کر سنائی تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کی عمر ستر کے آس پاس ہوگی لیکن ماشاء اللہ ایسے ہیں کہ بال بچوں نے پیچھے پڑ کر اور ادارے نے اصرار کر کے انہیں حال ہی میں ریٹائر کرایا ہے۔

اکرام صاحب نے مجھے اس گزرے دور کے احباب کے بارے میں تازہ اطلاعات فراہم کیں اور جب میں نے پوچھا کہ آپ کا گھر کہاں ہے تو انہوں نے نہ صرف یہ بتایا کہ اسلام آباد میں اپنا مکان بنایا ہے بلکہ یہ بات زور دے کر کہی کہ اپنی جائز کمائی سے بنایا ہے۔

اس لفظ جائز میں ایک بدلتی ہوئی صورت اور بگڑتی ہوئی نیت کی داستان روپوش ہے۔ میری صحافت کی زندگی کے آخری صفحات میں آپ مجھے ملنے والی پہلی اور آخری رشوت کی داستان بھی پڑھیں گے۔

ایک زمانہ تھا (ایوب خان کا دور) جب کہا جاتا تھا کہ ملک کی ساری دولت بائیس گھرانوں میں سمٹ گئی ہے۔ اب تو خیر یہ تعداد بہت زیادہ ہو چکی ہے اور اس میں ہمارے میڈیا کے کتنے ہی افراد کے نامِ نامی شریک ہوں گے۔

مگر میں نے اس دور کو نہیں چھیڑا ہے جو میرا نہیں ہے۔ اب تو جو جہاں ہے، چین سے رہے، اور درویش کی صدا کیا ہے۔

میں نے اس کتاب میں اپنی خطاؤں کا برملا اعتراف کیا ہے لیکن ممکن ہے کچھ کوتاہیاں ذہن سے نکل گئی ہوں یا قابلِ ذکر نہ ہوں۔ اسی طرح اپنے بعض قریبی ساتھیوں کی کمزوریوں کی طرف اشارے تو کیے ہیں لیکن جہاں پہنچ کر قلم رک جانے کا تقاضا کرتا ہے، وہاں میں نے قلم کا کہا مانا ہے۔

جس بات سے خوف آتا ہے، وہ یہ کہ کہیں کوئی بات غلط اور حقیقت کے برخلاف نہ لکھی

گئی ہو۔ اگر کسی میرے قاری کو ایسا کوئی مقام نظر آئے تو وہ مجھے ضرور ٹوکے۔ میر اای میل کا پتا نیچے درج ہے۔

آخر میں یادداشت کے ذخیروں کو کھنگالنے میں جن احباب نے میرا ہاتھ بٹایا ہے ان کا دل کی گہرائی سے شکر گزار ہوں۔ خصوصاً میرے دوست اور بھائی فرہاد زیدی اور راولپنڈی کے اکرام الحق کی عنایات کا کوئی شمار نہیں۔ اللہ کرے جیتے رہیں۔

رضا علی عابدی

مئی 2011ء

لندن

razaali33@hotmail.com
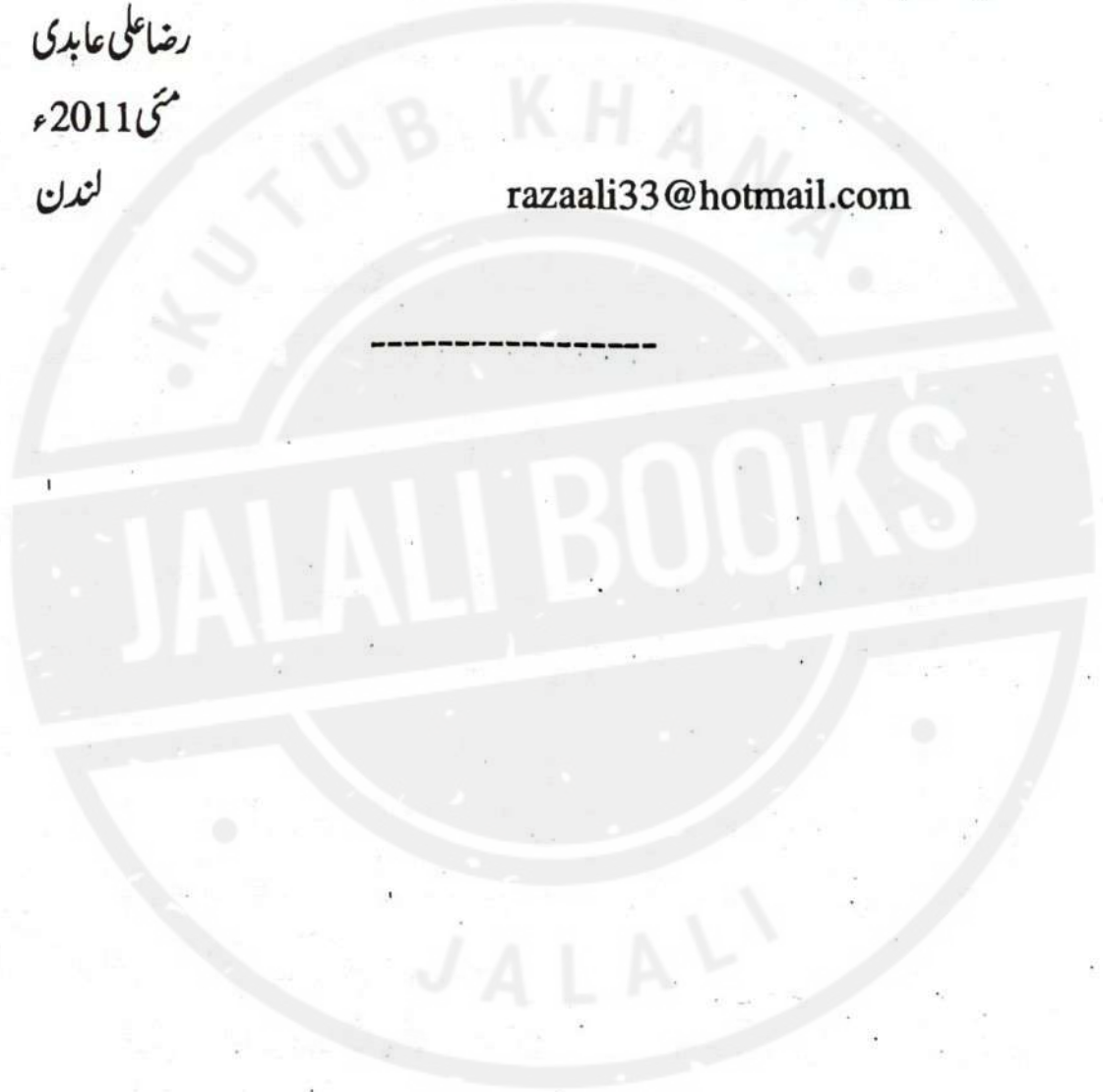
ہاں، میں پروف ریڈر تھا

سحاب قزلباش بڑی خوبیوں کی خاتون تھیں۔ خدا انہیں خوش رکھے کیونکہ جس سے وہ خوش ہوتی تھیں، اُسے آسمان پر بٹھا دیتی تھیں اور جس سے بگڑ جاتی تھیں اُسے خاک میں ملا دیتی تھیں۔ البتہ انہیں ایک کمال حاصل تھا، گھڑی میں روٹھتی تھیں، لمحہ بھر میں مان جاتی تھیں۔

میرے ساتھ کام کرتی تھیں۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ خدا ہی جانے کس بات پر مجھ سے ناراض ہو گئیں اور کسی محفل میں کچھ یوں کہتی سنی گئیں کہ ہم عابدی صاحب کو جانتے ہیں، اخبار جنگ میں پروف ریڈر تھے۔

بس، آج کی اِس تحریر کا مقصد اونچی آواز سے یہ اقرار کرنا ہے کہ ہاں، جب میں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا، میں اخبار جنگ میں پروف ریڈر تھا۔

کسی بھی نیوز روم کی سیڑھی کا یہ سب سے نیچا پائیدان ہوتا ہے، اس سے نیچے بس خاک ہوتی ہے۔

میں نے اپنی اڑان وہیں سے بھری تھی۔ میں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کا مترجم اور پروف ریڈر تھا۔ کوئی مجھے نہیں جانتا تھا۔

پندرہ سال بعد جب میں نے اخبار کی دنیا کو خیر باد کہا، میں ساڑھے چھ سو روپے کا نیوز ایڈیٹر تھا۔ اس وقت بھی کوئی مجھے نہیں جانتا تھا۔

اگر اور کچھ عرصے ٹِکا رہتا تو زیادہ سے زیادہ ہزار بارہ سو روپے کا ایڈیٹر ہو جاتا۔ اخبار کے آخری صفحے کے پیندے میں میرا باریک سا نام چھپا ہوتا۔ کچھ تھوڑے سے لوگ مجھے جان جاتے۔

پندرہ برس کی اس مشقت کے بعد جب میں بی بی سی لندن سے وابستہ ہو گیا اور ایک مرتبہ ابن انشاء مرحوم مجھ سے ملنے آئے تو یہ جان کر حیران رہ گئے کہ میں اُن ہی کے شہر کراچی کے قومی روزناموں میں ملازم تھا اور وہ مجھ سے واقف تک نہ تھے۔

میرے دنوں میں صحافت بڑا جان لیوا پیشہ تھا۔ اخبار میں دن رات کی شفٹ الگ الگ ہوا کرتی تھی۔ دن کے اوقات میں کام کرنے والا عملہ اخبار کے اندر کے صفحے تیار کیا کرتا تھا۔ اسی طرح رات کی شفٹ اخبار کا پہلا اور آخری صفحہ آراستہ کرتی تھی۔ اصل اہمیت ان ہی دو صفحوں کی تھی۔ تمام بڑی قومی اور بین الاقوامی خبریں پہلے اور آخری صفحوں پر ہوا کرتی تھیں۔ اندر کے صفحوں میں اداریئے، مراسلے اور اضلاع اور مضافات کی خبریں ہوتی تھیں جن کی اہمیت کم تھی۔ اسی مناسبت سے دن کے اوقات میں کام کرنے والے عملے کو بھی نسبتاً کم اہمیت حاصل تھی۔ اصل صحافی رات کی شفٹ کے کارکنوں کو تصور کیا جاتا تھا۔

میں نے کچھ عرصے دن کے اوقات میں کام کیا اور مسلسل اس احساس کا شکار رہا کہ میں ایک معمولی ملازم ہوں۔ خدا خدا کر کے رات کی شفٹ میں ایک جگہ خالی ہوئی اور میں اہم صحافیوں کی فہرست میں شامل ہوا۔

پھر بھی میں نیوز روم کی سیڑھی کے نچلے پائیدان پر رہا۔ اس وقت میرا کام شروع کے چند گھنٹوں میں خبروں کا ترجمہ کرنا تھا اور جب بہت سے مواد کی کتابت ہو چکتی تھی تو میں اس کے پروف پڑھا کرتا تھا۔

دن کی شفٹ میں دفتر آنا، دوپہر کا کھانا کھانا اور شام کو گھر واپس جانا کچھ اتنا دشوار نہ تھا۔ اس عمر میں روز دس پندرہ میل بائیسکل چلانا زیادہ نہیں کھلتا تھا۔ البتہ رات کا معاملہ جدا تھا۔ آنا جانا تو رہا ایک طرف، رات دیر تک بلکہ یوں کہیے کہ صبح تڑکے تک جاگ کر کام کرنا اور پھر سارا دن نیند کا خسارہ پورا کرنے کی ناکام کوشش کرنا جان لیوا محسوس ہونے لگا۔

اس وقت صحافت کے پیشے میں یہ بات سننے میں آنے لگی کہ صحافی کی زندگی کی شمع کے دونوں سرے بیک وقت جلتے ہیں اور وہ بھی یوں کہ روشنی دوگنی بھی نہ ہو اور عمر آدھی رہ جائے۔ بار بار چائے پینے اور جاگنے کے خیال سے تمباکو نوشی شروع کرنے کے نتیجے ظاہر ہونے تھے، وہ ہو کر رہے اور میرے گُردوں میں پتھریاں بننے لگیں۔ اتنی کہ میں چاہتا تو ان کا ہار بنا کر پہن لیتا۔

بعض اوقات یہ ہوتا کہ جاگا نہ جاتا۔ لکھتے لکھتے نیند غالب آنے لگتی اور ہاتھ سے قلم

چھوٹ جاتا۔صحافی بننے کا جنون اپنا معاوضہ مانگنے لگا۔

یہ کتاب لکھنے سے پہلے میں اپنے اُن ساتھیوں، دوستوں اور واقف کاروں کی فہرستیں بنا رہا تھا جن کی رفاقت میں میرے پندرہ برس گزرے۔

چند ایک کے سوا سارے کے سارے مرچکے ہیں۔

سب کی زندگی کی شمعیں دونوں سروں سے جلتے جلتے بجھ چکی ہیں۔راولپنڈی میں ایک نوعمر، ذہین اور خوش وضع کہ نام اس کا بھی حبیب الرحمان تھا، اللہ کو پیارا ہوا۔یہ 62-1961ء کی بات ہے اور اِدھر 2011ء میں محمد غیور اور منہاج برنا جیسے کہنہ مشق صحافی دنیا سے اُٹھ گئے۔اس کتاب کی اشاعت آخری مرحلے میں تھی کہ میرے ایک اور رفیق کار حبیب الرحمان بھی 5 ستمبر 2011ء کی صبح لندن میں چل بسے۔جب کبھی اخبارِ جنگ کی تاریخ لکھی جائے گی حبیب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔یوں گزر جانے والوں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالتا ہوں تو میر تقی میر کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے۔

خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

میری اس تحریر میں ان سب کا ذکر آئے گا۔اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے دور میں صحافت کا اور صحافیوں کا معیار کیسا تھا اور اس سے بڑھ کر اپنے اُن رفقاء کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی ایک پوری نسل دن کی شفٹ سے بھی فارغ ہوئی اور رت جگوں سے بھی بے نیاز ہوئی۔

اخبار کے پندرہ اور ریڈیو کے پچیس تیس برسوں نے مجھے جہاں سیکڑوں باتیں سکھائیں وہیں یہ گُر بھی سکھایا کہ عملی زندگی کے شروع کے دور کا اشتیاق اور جولانی جو بڑے بڑے کام کرالیتی ہے، وہ کارناموں سے کم نہیں ہوتے، عمر بڑھ جائے تو باگ پر گرفت اتنی مضبوط نہیں رہتی۔جس نے عمر کے اُس دور سے بھرپور فائدے اٹھائے وہ عمر بھر اس سرمائے سے فیض اٹھا سکتا ہے۔

شروع برسوں کی تکلیفوں کو یاد کرتا ہوں تو اب حیرت ہوتی ہے کہ میں نے کیسے کیسے کشٹ کتنی خوشی خوشی اٹھائے۔اب اُن کا تصور بھی باندھتا ہوں تو ایک بار جھرجھری سی آتی ہے۔بس یہ ضرور ہے کہ اُن زحمتوں کی بنیاد پر جو عمارت کھڑی کی اسے ایک نظر دیکھتا ہوں تو زحمتوں اور رحمتوں میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

کیسے اچھے دن تھے کہ شروع شروع کے بھولپن میں ان تکلیفوں کو ہم پُرلطف سمجھ بیٹھے

اور اپنے ہر دن کو سرشاری کا دن بنا کر رکھا۔

یہ کتاب اُن ہی اچھے برے دنوں کی داستان ہے۔ ایسی داستان جس میں باہر کہیں سے لا کر رنگ بھرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اونچ نیچ زندگی کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ جو اس آزمائش سے گزر جائے وہ میری اِس بات سے ضرور اتفاق کرے گا کہ قدرت نے انسان کو عجب سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ اپنے دکھ، اپنے رنج، اپنی کلفتیں اور اُن سے بھی بڑھ کر اپنی کدورتیں بھول جاتا ہے۔ نہ بھولے تو دم نکل جائے آدمی کا۔

اس لیے میں اپنی اِس تحریر کو بوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ جہاں میں زندگی کے دشوار زمانے بیان کروں گا وہاں سطروں کے درمیان یہ بھی لکھتا جاؤں گا کہ میں کتنا خوش، کتنا سرشار تھا۔

وہی خوشی اور وہی سرشاری میری انگلی تھامے تھامے مجھے اس آخری سَرحد تک لا کر چھوڑ گئی جہاں میری پیشہ ورانہ زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ جو دن گزار لیے گئے وہ پرانے گانوں کی مانند ہیں جو کتنے ہی قدیم سہی، آج بھی اچھے لگتے ہیں۔

---------O---------

ہندو اخبار میرے استاد ٹھہرے

بارہ برس کے ایک لڑکے کی تصویر اپنے ذہن میں بنائیے جو ہر صبح پڑوس کی دکان میں بیٹھ کر سخت گیر ہندو اخبار تیج، پرتاپ اور ملاپ پڑھتا ہو۔

وہ میں تھا اور اُس زمانے میں یہ تینوں بڑے قومی اخبار اردو میں شائع ہوتے تھے۔ تیج کا لب ولہجہ کٹّر تھا۔ روزنامہ پرتاپ ذرا معتدل تھا اور ملاپ، جیسا کہ اِس کے نام سے ظاہر ہے، اتنا سخت گیر نہ تھا مگر یہ سارے ہندو اخبار تھے اور عام لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچنے کے لیے اردو میں چھپتے تھے۔ اُس وقت عوام کی زبان یہی تھی۔

میں ان کی کتابت دیکھ کر حیران ہوا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کے کاتب اور خوش نویس بھی ہندو ہوا کرتے ہوں گے کیونکہ اُن کی تحریر میں وہ نفاست نہ تھی جس کے لیے دلّی کی کتابت مشہور تھی۔ عمدہ کَش اور نفیس دائرے مسلمانوں کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں میں الگ سے نظر آتے تھے جبکہ تیج کی کتابت بھونڈی، پرتاپ کی بھدی اور ملاپ کی معمولی ہوا کرتی تھی۔

آج سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اس کم عمری میں بھی میں کتابت کی باریکیوں پر غور کرنے لگا تھا لیکن اُس سے بھی زیادہ میری توجہ مخصوص اخباری زبان پر تھی۔ دوسری عالمی جنگ ختم ہو رہی تھی۔ آزادی کا وقت قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا اور اخباروں پر ایک گہما گہمی کی کیفیت طاری تھی۔ شاید وہی دن تھے جب میری اخبار بینی کے ساتھ ساتھ اخبار نویسی کی تربیت بھی چپ چاپ شروع ہو گئی۔

ان اخباروں کی ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ اُن کے ادارتی صفحے پر دو چار کالم ضرور

ہوتے تھے اور وہ عموماً ایک لطیفے سے شروع ہوا کرتے تھے۔ میں وہ لطیفے لکھ کر بچوں کے رسالے ''کھلونا'' کے ایڈیٹر ادریس دہلوی کو بھیج دیا کرتا تھا۔ انہوں نے ایک بھی نہیں چھاپا۔

بالآخر سن 50ء میں شفیق الرحمان کی کتاب ''حماقتیں'' میری نظر سے گزری اور میں نے بڑی مستعدی کے ساتھ اُس میں سے ایک لطیفہ نقل کر کے ادریس دہلوی کو بھیج دیا۔ ''کھلونا'' میں وہ لطیفہ اُسی مہینے چھپ گیا۔ میں مسرور بھی ہوا اور نادم بھی کہ میری پہلی تحریر شفیق الرحمان کی کتاب سے نقل کی گئی۔

وقت گزرتا گیا اور شفیق الرحمان کی کتابوں سے میری رغبت بڑھتی گئی۔ جب وقت اِس قدر گزر گیا کہ ادریس دہلوی مرحوم سے میری دوستی ہوگئی تو میں نے انہیں یہ سارا واقعہ سنایا۔ بہت محظوظ ہوئے۔ میں نے کہا کہ دیکھیے میں نے ''حماقتیں'' آپ سے پہلے پڑھ لی تھی۔ کہنے لگے ''جی ہاں، میں حماقتوں میں اکثر تاخیر کرتا ہوں۔''

حماقتوں میں یہ تاخیر اُن کی وفات کے بعد تک چلی۔ بھائی بہنوں کے آپس کے جھگڑوں میں اُن کا ماہنامہ ''شمع'' اور ''کھلونا'' دونوں بند ہو گئے۔ نہ شمع کا کوئی انتخاب شائع ہوا نہ کھلونا کا۔ میں نے ایک بار اُن کے بڑے بھائی یونس دہلوی سے پوچھا کہ آپ کے رسالوں میں چوٹی کے ادیب اور شاعر لکھا کرتے تھے، کبھی ''شمع'' اور ''کھلونا'' کا انتخاب شائع کرنے کا خیال آیا آپ کو؟ بولے ''جی نہیں۔'' میں نے کہا کہ ان رسالوں کی فائلیں تو محفوظ ہوں گی۔ اتنے آہستہ سے جی ہاں کہا کہ اس پر بھی جی نہیں کا گمان ہوا۔

خیر۔ بات دور نکل گئی۔

میرے والد صدی کے شروع میں لکھنؤ چھوڑ کر روڑکی چلے گئے تھے جہاں انگریزوں نے ہندوستانی لڑکوں کو پڑھانے کے لیے بہت بڑا انجینئرنگ کالج کھولا تھا۔ والد صاحب نے وہیں تعلیم پائی۔ پھر وہیں پڑھانے لگے اور ریٹائر ہو کر وہیں رہ پڑے۔ اُن کے سات بیٹے پیدا ہوئے جو اپنے وقت کی روایت کے مطابق انجینئرنگ پڑھنے لگے۔ اس وقت ہمارے گھر میں پڑھنے لکھنے کا رواج تو بہت تھا مگر اخبار پڑھنے کی عادت کسی کو نہ تھی۔ صرف ایک بھائی ماہنامہ ''شمع'' کے معمے بہت شوق سے بھرتے تھے اور وہ گھر میں یہ رسالہ لاتے تھے۔ وہ سارے بھائیوں کے نام سے معمہ بھر کر بھیجا کرتے تھے۔ صرف ایک بار اُن کا بھیجا ہوا حل بالکل صحیح نکلا جو اتفاق سے میرے نام سے بھیجا گیا تھا۔ اس ماہ ''شمع'' کے ایک صفحے کی پیشانی پر جلی حروف میں میرا نام

شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے اُس صفحے کو میں نے بیسیوں بار دیکھا ہوگا۔

میں ''شمع'' کو بہت باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اُس کے رومانوی افسانوں کی طرزِ تحریر مجھے اچھی لگتی تھی۔ سُبک سُبک سے مکالمے پڑھنے میں بھی سرگوشی کا تاثر پیدا کرتے تھے لیکن ایک اور چیز جس سے مجھے غیر معمولی دلچسپی تھی، وہ ''شمع'' میں شائع ہونے والے اردو رسالوں کے وہ اشتہار ہوتے تھے جن میں لکھا ہوتا تھا ''نمونہ مفت طلب کیجیے۔''

میں ہر رسالے کا نمونہ منگانے لگا اور گھر میں ایک اچھا خاصا دارالمطالعہ بن گیا۔ کچھ رسالے میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہیں: آستانہ، مولوی اور منادی۔ پہلے دو رسالے تو خالص مذہبی رنگ لیے ہوئے تھے۔ اوپر سے توہم پرستی کا بھی اچھا خاصا پرچار ہوتا تھا لیکن ماہنامہ منادی نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ محترم حسن ثانی نظامی کو آج تک بتاتا ہوں کہ آپ کے والد کی نثر بے مثال ہوتی تھی۔ غالب کے خطوط اور سر سیّد اور ان کے رفقاء کی تحریروں کی طرح خواجہ حسن نظامی مرحوم گفتگو کی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ میں آج بھی کبھی صحافت کے موضوع پر تقریر کرتا ہوں تو یہ ضرور کہتا ہوں کہ دل میں اترنے والی سب سے مؤثر زبان گفتگو کی زبان ہوا کرتی ہے۔

اس دوران مجھے بھی اور میرے بھائیوں کو بھی اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ میں سات بھائیوں میں یوں سب سے جدا ہوں کہ میرا سائنس اور انجینئرنگ کی طرف ذرا بھی رجحان نہیں۔

ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ والد کا کاروبار صفر پر آ کر رک گیا۔ وہ ویسے بھی پاکستان کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ میری بڑی بہن بتاتی تھیں کہ لاہور کے اُس تاریخی جلسے کی فلم میں ابّا نظر آتے ہیں جس میں قیام پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی تھی۔

ہمارے گھر کا زیادہ تر سامان اونے پونے بکا۔ میرا دارالمطالعہ ردّی والے تول کر لے گئے۔ ہم نے خود کو سمیٹا اور بہنیں پہلی بار برقع کے بغیر امرتسر جانے والی ٹرین میں بٹھائی گئیں۔ یہ سنہ 50ء کے آخر کی بات ہے۔ اگرچہ فسادات ختم ہو چکے تھے مگر احتیاط ضروری تھی۔

سارا کنبہ واہگہ کی سرحد پر پہنچا۔ بھارت کے کسٹم والے ہمارا سامان دیکھنے لگے۔ ایک بڑے سے صندوق میں محرّم کی عزاداری کا سامان اور قدیم تاریخی علم بند تھے۔ ایک افسر اسے کھولنے لگا۔ میں نے کہا کہ اس میں ہماری مذہبی چیزیں ہیں، وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

ہم کراچی کی ٹرین لینے کے لیے لاہور کے اسٹیشن پر پہنچے۔ والد صاحب نے سارا

سامان بریک میں رکھوانے کے لیے بُک کرایا تو پاکستان ریلوے کے افسر نے بھارت کے مقابلے میں اتنی زیادہ رقم بتائی کہ والد صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا مگر پھر وہ زیرِلب بولے۔ ''خیر۔کوئی بات نہیں۔ یہ اپنا ہی وطن ہے۔''

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے وطن نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ میرے سارے بھائی انجینئرنگ کے مختلف شعبوں میں کامیابی کے مرحلے طے کرنے لگے۔ البتہ میرے بارے میں طے ہو گیا کہ میں جس قوام سے بنا ہوں وہ مختلف ہے۔ کراچی آ کر کسی اسکول میں داخلہ نہیں ملا۔ مشکل سے حیدر آباد دکن کے ٹرسٹ کے بہادر یار جنگ ہائر سیکنڈری سکول میں داخلہ مل گیا لیکن تعلیم کا سلسلہ ٹوٹنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جماعت میں پیچھے رہ گیا اور خصوصاً سائنس کے مضامین بالکل نہ پڑھ سکا۔

والد صاحب چند ماہ بعد انتقال کر گئے۔ میرے سلسلے میں بھائیوں کی کچہری بیٹھی اور طے یہ پایا کہ مجھے وہ مضامین پڑھائے جائیں جو صحافت میں میرے کام آئیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ میں کالج میں سیاسیات اور معاشیات پڑھوں گا۔

اُس وقت میں نے پوچھا تھا ''یہ معاشیات کیا ہوتا ہے؟''

---------O---------

سمندر کدھر ہے؟

سنہ پچاس کا خاتمہ قریب تھا جب ہم کراچی کے سٹی اسٹیشن پر اترے۔ اترتے ہی میں نے پہلی بات، یہ پوچھی کہ سمندر کدھر ہے؟

اگلی صبح کراچی کے دو اخبار دیکھے۔ جنگ اور انجام۔ جنگ میں ٹارزن کی تصویری کہانی دلچسپ لگی اور انجام میں ابن حسن نگار کی تصویری کہانی دیکھی جو اسلامی ناولوں اور الف لیلیٰ کا گھ جوڑ لگا۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اخبار ڈان اردو میں بھی چھپتا تھا اور اس میں کتابت نہیں ہوتی تھی بلکہ ٹائپ کے ذریعے چھاپا جاتا تھا۔ اردو ڈان ہمارے آنے سے ذرا عرصے پہلے بند ہوا تھا اور سندھ مدرسے کے کشادہ دالان میں ڈان کا وہ عظیم الشان بین الاقوامی مشاعرہ ہو چکا تھا جسے مجید لاہوری مرحوم نے عظیم الڈان کا نام دیا تھا اور جس میں ایک لڑکی کے ترنم اور شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ زہرہ نگاہ تھیں۔

اخباروں کے لیے اگرچہ شہر لاہور کو بہت شہرت حاصل تھی لیکن کراچی بھی کسی سے پیچھے نہ تھا۔ یہاں سے اُس وقت اردو کے چار بڑے قومی اخبار جنگ، انجام، امروز اور احسان نکلتے تھے۔ شام کے وقت اردو کے دو اخبار مسلمان اور نئی روشنی شائع ہوتے تھے۔ انگریزی کا روزنامہ ڈان پہلے سے موجود تھا، مارننگ نیوز شروع اور سول اینڈ ملٹری گزٹ ختم ہو رہا تھا۔ شام کے وقت اخبار لیڈر اور ایوننگ اسٹار جاری ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔ البتہ شہر میں گجراتی بولنے والی اچھی خاصی بڑی آبادی کے لیے صبح کے وقت اخبار ملّت اور ڈان گجراتی اور شام کو وطن نکلتا تھا

جس کے ہاکر ''وطن ودھارو'' کی صدائیں لگایا کرتے تھے۔ شام جب ڈھلنے لگتی تھی تو شام کے اخباروں کی قیمت آدھی کردی جاتی تھی۔

کسی اور کو ہو یا نہ ہو، مجھے شہر کے اخباروں کا مکمل علم تھا۔ کس اخبار کا دفتر کہاں تھا، مجھے معلوم تھا۔ یہاں تک کہ اُن سڑکوں کے نام بھی یاد تھے جہاں سے یہ اخبار نکلتے تھے۔ نئی روشنی کا دفتر بولٹن مارکیٹ کے قریب لکشمی بلڈنگ کے سامنے نکل روڈ پر تھا۔ روزنامہ احسان سندھ مدرسے کے سامنے والی سڑک پر تھا جو شاید مشن روڈ کہلاتی تھی۔ ڈان اور گجراتی کے دونوں اخبار نیو چالی سے نکلتے تھے۔ جنگ، مسلمان اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کے دفتر برنس روڈ پر تھے۔

ان اخباروں میں تصویریں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ہفتے بھر کی تصویریں جمع کر کے اتوار کے پرچے کے پہلے اور آخری صفحے پر عموماً گہرے نیلے رنگ میں چھاپی جاتی تھیں۔ اتوار کے پرچے کو ذرا زیادہ ہی اہمیت حاصل تھی۔ اس میں نامور شاعروں کی طویل نظمیں اور طنز ومزاح لکھنے والے سرکردہ مصنفوں کے کالم ضرور ہوتے تھے جو بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ میں اخبار امروز میں طفیل احمد جمالی کا کالم ضرور پڑھتا تھا جو بُت شکن کے نام سے نہایت عمدہ طنز لکھتے تھے۔ وہ بعد میں چین چلے گئے تھے۔ اخبار جنگ میں ابراہیم جلیس اور مجید لاہوری کے کالموں کی بہت دھوم تھی۔ اتوار کے روز مجید لاہوری نثر نہیں بلکہ نظم لکھتے تھے اور کراچی کے مخصوص لب و لہجے سے اپنے کلام کو آراستہ کرتے تھے۔ اُس روز جنگ میں رئیس امروہوی مرحوم کی طویل مگر بہت گاڑھی نظم چھپا کرتی تھی۔

کوئی پوچھے کہ مجھے اُن اخباروں کے سنڈے ایڈیشن سے اتنی دلچسپی کیوں تھی؟ اس روز ان سارے اخباروں میں بچوں کا صفحہ بھی ہوتا تھا۔ مجھے زیادہ غرض اِسی ایک صفحے سے تھی۔ خصوصاً روزنامہ جنگ کا یہ صفحہ جو ''نونہال لیگ'' کہلاتا تھا، مجھے بہت عزیز تھا کیونکہ اُس میں میری لکھی ہوئی چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ کوئی بھائی جان تھے جو اس صفحے کو ترتیب دیا کرتے تھے۔

یوں تو بہت سے لڑکے لڑکیاں اُس میں لکھا کرتے تھے مگر غازی صلاح الدین نامی لڑکے کی تحریریں بڑی بھلی ہوتی تھیں۔ میں نے اسکول میں اس کا ذکر کیا تو کسی نے کہا کہ وہ بھی اسی بہادر یار جنگ اسکول میں پڑھتا ہے، نویں جماعت کا طالب علم ہے اور وہ سامنے جا رہا ہے۔

یہ بات 1952ء کی ہے۔ میں فیل ہو گیا تو غازی بھی میری جماعت میں آ گئے۔ ہم دونوں اس وقت سے دوست ہیں۔ دوست تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں، ہماری دوستی کے لیے کوئی

لفظ اِس سے بڑھ کر ہوتا تو اچھا ہوتا۔

جس زمانے میں لڑکے لڑکیاں نونہال لیگ کے لیے کہانیاں لکھ رہے تھے، ترقی پسندی کا بخار پوری طرح نہیں اترا تھا۔ یہ ساری کہانیاں اِس قدر افسردہ کرنے والی ہوتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ مثال کے طور پر اُن کے عنوان دیکھیے: کلرک کی عید۔ مزدور کے بچے۔ ماں کی دوا۔ غریب کی بیوی۔ فاقہ زدہ چپڑاسی وغیرہ وغیرہ۔

کوئی شگفتہ اور سرشار تحریر بس کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتی تھی تو سوال یہ ہے کہ اس صفحے کے یہ ''بھائی جان'' کون صاحب تھے۔ ایک بار میں اخبار کے دفتر جا پہنچا اور کہا کہ بھائی جان سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ اُن کا نام میر جمیل الرحمان ہے اور اس وقت اتفاق سے دفتر میں موجود ہیں ورنہ وہ تعلیم میں مصروف رہتے ہیں اور جغرافیے کے طالب علم ہیں۔

میری اُن سے ملاقات کرائی گئی۔ سرخ وسفید نوجوان جن کے چہرے کے مہاسے اور بھی زیادہ سرخ تھے۔ البتہ اس چہرے پر ایک مسلسل مسکراہٹ تھی۔ بہت اچھی طرح ملے اور راز کی بات وہیں بتا دی۔ کہنے لگے کہ کہنے کو بھائی جان میں ہی ہوں لیکن اصل میں نونہال لیگ کے انچارج شفیع عقیل صاحب ہیں۔ آیئے آپ کو اُن سے ملواؤں۔

یوں روزنامہ جنگ کے بچوں کے صفحے کے نگران سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ ایک دوستی سی ہو گئی۔ میں ہر ہفتے کچھ نہ کچھ لکھ کر لے جاتا اور اسی بہانے ان کے دفتر میں کچھ دیر بیٹھتا۔ اخبار کے دفتر میں بیٹھنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں اٹھنے لگتا تو میرے اندر کا صحافی کہتا کہ تھوڑی دیر اور۔

وہیں میری ملاقات اخبار کے کارٹونسٹ بی اے نجمی سے ہوئی۔ جنگ کا ادارہ بچوں کا رسالہ بھائی جان جاری کرنے والا تھا جس میں نجمی کو کارٹونوں کے علاوہ بچوں کی تصویریں بھی بنانی تھیں۔ چنانچہ مشق کے طور پر انہوں نے ایک روز میری تصویر بنائی اور چلتے ہوئے مجھے دے دی۔ وہ کہیں کھو گئی جس کا مجھے بہت دن افسوس رہا۔

شفیع عقیل ماہنامہ ''بھائی جان'' کی تیاری کرنے لگے۔ بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں سے کچھ نہ کچھ لکھوایا جا رہا تھا۔ مجھے رسالے کا بے چینی سے انتظار تھا اور میری خواہش تھی کہ اس کا سالانہ خریدار بنوں اور میرا خریداری نمبر ایک ہو۔ مجھے نو نمبر ملا۔ رسالہ چند برس بعد بند ہو گیا۔

شفیع عقیل کی عمر اُس وقت پچیس برس سے کم ہی تھی۔ ذرا سا دبتا ہوا قد کسرتی بدن، جی کھول کر قہقہہ لگاتے تھے۔ دوستوں کے بڑے حلقے کے درمیان رہتے تھے۔ لاہور سے کراچی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ نوجوانی ہی سے لکھنے لگے۔ دنیا بھر کا سفر کیا۔ ساری دنیا کی لوک کہانیاں اردو میں ترجمہ کیں۔ نظمیں بھی لکھیں، اردو اور پنجابی میں۔ گورمکھی پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک دور آیا تھا جب شفیع عقیل اور ان کے دوست افسانے لکھ رہے تھے اور شاید ان کی نوعیت خالص نفسیاتی ہوتی تھی، اس لیے یہ لوگ انہیں ''نفسانے'' کہا کرتے تھے مگر یہ ترکیب رواج نہ پا سکی۔

شفیع عقیل اب (2011ء) خیر سے اسّی برس سے اوپر ہو چکے ہیں اور ہفت روزہ اخبار جہاں میں ان کا عمل دخل اب بھی ہے۔ شین عین کے نام سے نئی نئی کتابوں کا تعارف لکھتے ہیں جنہیں بعض لوگ تبصرے کہتے ہیں۔

ان کے نونہال کلب نے اردو کو بہت سے ادیب، شاعر، ڈراما نگار اور دانشور دیئے جن میں غازی صلاح الدین کے علاوہ نسیم درانی، افسر آذر، عبید اللہ علیم، حسینہ معین، محمد عمر میمن، نعیم آروی، قمر علی عباسی اور انور شعور قابل ذکر ہیں۔

اُن دنوں میں جیکب لائنز میں بندر روڈ کے کنارے رہتا تھا۔ ہماری بیرک کا نمبر تین اور اس میں ہمارے کوارٹر کا نمبر پانچ تھا۔ اس تین بٹا پانچ جیکب لائن سے روزنامہ جنگ تک پیدل سفر کے دوران راہ میں ملازمت دلانے کا دفتر، امریکی اسپتال اور گرجا گھر، امریکی لائبریری، ناز اور نشاط سینما، ریڈیو پاکستان کی جڑواں عمارت، محمد علی ٹرام وے کمپنی کا ٹرمینل، پلازہ سینما، جانوروں کا اسپتال، ریڈیو پاکستان کی نشرگاہ، اردو بازار، اردو اکیڈمی سندھ، سلطان اینڈ سنز کتب فروش، ماما پارسی گرلز اسکول، حکیموں کے دو ایک بڑے مطب اور سندھ اسمبلی کی قدیم عمارت کے علاوہ دو مقامات اور بھی پڑتے تھے۔ ایک تو سعید منزل جہاں سے ہر سال محرم کے جلوس پر چند ایک پتھر ضرور آتے تھے اور دوسرا جماعتِ احمدیہ کا دارالمطالعہ جہاں شہر کے اخبار پڑھنے کے لیے میں ضرور رُکا کرتا تھا۔ اس عمارت کی پیشانی پر لکھا ہوا ایک شعر جو مجھے آج تک یاد ہے، اکثر حیران کرتا تھا کہ یہ اتنا کمزور شعر اتنی شان سے کیوں لکھا گیا ہے۔ شعر یوں تھا:

آؤ لوگو کہ یہاں نورِ خدا پاؤ گے
لو تمہیں طور تسلی کا سکھایا ہم نے

شعر کی اہمیت بعد میں پتا چلی۔جن صاحب کے ذہن کی یہ تخلیق تھی ان پر نازل ہونے والی ایک آیت اور اس کا ترجمہ عمارت کے اندر لکھا گیا تھا جو کچھ اس طرح پر تھا ''میں تمہاری تبلیغ کو زمین کے آخری کناروں تک پہنچاؤں گا۔'' آیت لانے والے فرشتے کو اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ زمین گول ہے اور اس کے کنارے نہیں ہوتے۔

اس طرح کی الہامی گتھیوں کو دل ہی دل میں سلجھاتا میں ذرا دیر کے لیے ریڈیو پاکستان کی شاندار عمارت کے سامنے ضرور ٹھہرتا اور اس کی چاردیواری کی جالیوں سے بڑے بڑے لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا۔ان میں خوش لباس خواتین سے لے کر اپنے باجے گاجے اٹھائے ہوئے سازندوں تک ہر طرح کی مخلوق شامل ہوتی۔اس وقت مجھے ریڈیو پاکستان کا وہ پروگرام یاد آتا ہے جس کی پہچان کے لیے ترتیب دی جانے والی موسیقی پروگرام کے نام پر ترتیب دی گئی ہوگی۔

دیکھتا چلا گیا، دیکھتا چلا گیا

اس کے بعد میں اخبار جنگ کے دفتر میں داخل ہوا اور صحافی بننے کی خواہش نے یوں سر ابھارا کہ کچھ عرصے بعد میں اخبار کے عملے میں بھی شامل ہو گیا مگر اس کی روداد شدید مشقت کی روادار ہے جس نے میرا یہ حال کیا کہ مجھے یہ تک یاد نہ رہا کہ سمندر کدھر ہے۔

---------O---------

پہلی کتاب، پہلی ملازمت

جیکب لائنز کے علاقے میں جہاں اب بندو خان کا کباب پراٹھے کا روزگار ہے یہاں کھیل کود کا میدان ہوا کرتا تھا۔ علاقے کے لڑکے شام کے وقت وہاں کھیلا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے ان لڑکوں کی ایک الگ ٹولی بن گئی جو کہانیاں، نظمیں، لطیفے اور پہیلیاں لکھ کر اخباروں کو بھیجا کرتے تھے۔ میں بھی اُن میں شامل تھا اور ہم لوگ بچوں کا اخبار نکالنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

ایک روز ایک لڑکا خبر لایا کہ اس کی لکھی ہوئی کتاب چھپ گئی ہے۔ ہم سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اس نے سولہ صفحوں کی وہ کتاب ہمارے سامنے رکھ دی جس کی قیمت دو آنے تھی۔ لڑکوں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

پتا چلا کہ سول اسپتال کے قریب سستی کتابوں کی ایک دکان ادبی بک ڈپو ہے۔ وہ لوگ بچوں کی کہانیاں چھاپتے ہیں اور اس طرح کی کتاب لکھنے والے کو دو روپے بھی دیتے ہیں۔

میں اس وقت نوعمر مصنف کی خوشامد کر کے اس کی کتاب اپنے گھر لے گیا۔ کتاب کی طوالت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے لفظ گنے اور ایک دو روز لگا کر ویسی ہی بچوں کی کہانی لکھ دی۔ پھر ایک شام اپنا مسودہ لے کر بڑی شان سے ادبی بک ڈپو پہنچا۔ اس کے مالک اور مالک کے نوجوان بیٹے نے میری پذیرائی کی۔ کتاب نہ صرف قبول کر لی بلکہ یہ بھی کہا کہ کتاب ذرا طویل ہے، ہم اسے دو حصوں میں چھاپیں گے اور اس طرح مجھے دو نہیں بلکہ چار روپے ملیں گے۔

چند ہی روز میں میری لکھی ہوئی زندگی کی پہلی کتاب بازار میں آ گئی۔ یہ بات

1952-53ء کی ہے۔ ادبی بک ڈپو والوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم ٹارزن کی کہانیاں لکھ سکتے ہو؟ میرے پاس تو ٹارزن کے بہت سے کامِک جمع تھے۔ میں نے خوش ہو کر گردن کو جنبش دی اور پھر تو میرے قلم کو ایسی جنبش ہوئی کہ میری کتابیں جنہیں کتابچے کہنا مناسب ہوگا، متواتر چھپنے لگیں اور مجھے پہلی کتاب کے معاوضے کے طور پر ایک ایک روپے کے دو سکّے ملے۔

ایک روز اسکول کی اسمبلی میں اعلان ہوا کہ ہمارے طالب علم رضا علی کی لکھی ہوئی کتاب اسکول کی لائبریری میں آ گئی ہے اور کل ہی رجسٹر میں اس کا اندراج ہوا۔ کسی نے تالی نہیں بجائی۔

اُن دنوں کراچی سے شائع ہونے والا بچوں کا ایک رسالہ بہت مقبول ہو رہا تھا۔ یوں اس کا نام نونہالِ پاکستان تھا لیکن اس کے سرِورق پر لفظ پاکستان اتنا باریک سا لکھا جاتا تھا کہ وہ صرف نونہال کے نام سے مشہور ہوا۔ رسالہ بہت دلچسپ تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اس میں کچھ ذہین لوگوں کا دخل تھا۔

رسالے نے اپنے ایک شمارے میں اعلان کیا کہ اس میں شائع ہونے والی کہانیوں اور نظموں کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ بس پھر کیا تھا، اُدھر ادبی بک ڈپو نے شاید میرا اشتیاق دیکھ کر ان دو روپوں سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ معاوضے کا اعلان پڑھتے ہی میں نے شفیق الرحمان کے انداز میں ایک شگفتہ مضمون لکھ کر نونہال کو بھیج دیا۔

چند روز بعد ہی مجھے نونہال کے ایڈیٹر حامد یار خاں عرف حامد کانپوری کا پوسٹ کارڈ ملا۔ اس میں لکھا تھا ''پیارے دوست، آپ کا مضمون ملا جو ادارے میں بہت پسند کیا گیا۔ یہ مضمون اگلے ہی شمارے میں شائع ہو جائے گا۔ ہماری درخواست ہے کہ نونہال کے لیے باقاعدگی سے لکھتے رہیں۔ والسلام۔''

پوسٹ کارڈ پڑھ کر میری تو نیندیں اڑ گئیں۔ میں اِس خیال سے مسرور تھا کہ میں ایک قدم آگے بڑھ رہا ہوں۔ آئندہ ماہ کا شمارہ آیا تو اس میں اپنا مضمون اور جلی حروف میں اپنا نام دیکھا۔ رسالے کے مصور ایم اختر نے موضوع کی مناسبت سے تصویر بھی بنائی تھی۔ اس شام کھیل کے میدان میں لڑکوں کا بڑا مجمع لگا۔ ایک لڑکے نے حیرت سے پوچھا ''تم اتنا اچھا کیسے لکھ لیتے ہو؟''

نونہال کے لیے اپنا اگلا مضمون میں نے ڈاک سے نہیں بھیجا بلکہ خود لے کر گیا۔ ان

کے دفتر میں بیٹھا۔ نکڑ والے ہوٹل سے چائے منگائی گئی اور بہت سی باتیں بھی ہوئیں۔ حامد یار خان بہت تپاک سے ملے۔ ان سے بھی زیادہ گرم جوشی سے ایک اور صاحب ملے جن کا نام ادریس صدیقی تھا اور ان کا تعلق بھی کانپور سے تھا۔ مجھے وہ نام سنا سنا سا لگا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ انہوں نے کانپور سے بچوں کا ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ اتنا دلچسپ رسالہ میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

ادریس صدیقی بہت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ادیب اور شاعر تھے اور چونکہ کوئی روزگار نہ تھا، نونہال کی ترتیب میں ہاتھ بٹارہے تھے۔ حامد یار خاں کوئی بڑے کھاتے پیتے انسان نہیں تھے لیکن بچوں کے رسالے میں نت نئی اختراع بہت شوق سے کیا کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہر ماہ رسالے کے بنڈل ملک کے تمام شہروں اور قصبوں کو بھیجے جاتے تھے۔ اوپر سے وہ چونکہ شمع معمے کی غیر معمولی مقبولیت کا دور تھا، نونہال کے معمے بھی اتنے مقبول ہوئے کہ انہوں نے رسالوں کے اسٹالوں پر چھوٹے چھوٹے لیٹر بکس لگوادیے جس میں لوگ اپنے حل کیے ہوئے معمے اور رقم ڈال جاتے تھے۔ رسالے کے دفتر میں بڑی اچھی سی خوشحالی نظر آتی تھی۔

اب میں وہاں باقاعدگی سے جانے لگا اور ادریس صدیقی کی طرح نونہال کی ترتیب میں ہاتھ بٹانے لگا۔ یہ میرا کالج کا زمانہ تھا۔ ہم لوگ جیکب لائنز سے اٹھ کر ناظم آباد کے بلاک نمبر چار میں آباد ہو چکے تھے۔ میں روز صبح اپنی بائیسکل پر بیٹھ کر اسلامیہ کالج جاتا جو اس وقت گرومندر کے قریب تھا۔ وہی چھوٹا سا گرومندر جسے مشرف بہ اسلام کر کے اتنی ہی چھوٹی سی سبیل والی مسجد بنا دیا گیا اور اب تو وہ مسجد کشادہ ہوتے ہوتے عظیم الشان گول عمارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

کالج میں شروع کی دو یا تین کلاسوں میں شرکت کر کے میں اپنی اسی بائیسکل پر نونہال کے دفتر چلا جاتا اور دن کا بڑا حصہ وہیں گزارتا۔ حامد کانپوری نکڑ والے ہوٹل سے میرے لیے کھانا منگاتے۔ اس طرح میرا اور ان کا دونوں کا بھلا ہو جاتا۔ ہم نے رسالے میں نئے نئے تجربے کیے۔ امریکی رسالوں کی طرح تھری ڈی تصویریں چھاپیں جس کے ساتھ نیلا اور سرخ چشمہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بچوں کے چھوٹے چھوٹے ناول اور اردو کامِک چھاپے۔ رسالے کی مقبولیت بڑھتی گئی اور ایک ماہ حامد صاحب نے مجھے ستر روپے دیے۔ یہ زندگی میں میری پہلی تنخواہ تھی۔ اس مناسبت سے دیکھا جائے تو حامد کانپوری میرے پہلے باس تھے۔

اسی دوران ہم نے نونہال کا سالنامہ نکالا۔ اس میں نیّر مسعود رضوی کی تحریر بھی تھی۔ اردو کے بڑے اسکالر محمد عمر میمن کا لکھا ہوا بچوں کا ناول بھی چھاپا اور حامد صاحب کو خدا جانے کیا

سوجھی، انہوں نے بڑوں کا رسالہ فنکار بھی جاری کر دیا۔ خاصا بالغ رسالہ تھا۔ اس میں اشتہار بھی بالغ تھے کیونکہ اکسیری دواخانے کا سارا کاروبار ایسے ہی رسالوں میں اشتہار شائع کرانے سے چلتا تھا۔

ان دنوں ایک خوش شکل نوجوان آتا تھا اور ماہنامہ فنکار میں چھپوانے کے لیے مخصوص سرکاری کاغذوں پر لکھی ہوئی اپنی غزلیں دے جاتا تھا۔ میں ان غزلوں کو پڑھتا تو حیران ہوتا کہ یہ نوجوان اتنی اعلیٰ، معیاری غزلیں فنکار جیسے معمولی رسالے میں کیوں شائع کراتا ہے۔ ماہنامہ افکار، رومان اور نقاد جیسے عمدہ رسالوں کے دفتر بھی برنس روڈ کی ان ہی گلیوں میں تھے۔ میں نے حامد صاحب سے پوچھا کہ یہ نوجوان اتنے اچھے رسالوں کے دفتروں میں کیوں نہیں جاتا۔ انہوں نے کہا ''جاتا ہے اور وہ سب اس کی غزلیں شائع کرتے ہیں کیونکہ یہ صاحب نیوز پرنٹ کنٹرولر کے دفتر میں ملازم ہیں اور تمام رسالوں کو اخباری کاغذ کا کوٹہ یہی صاحب دیتے ہیں۔ رسالے ان کی غزلیں شائع نہیں کریں گے تو بھوکوں مریں گے۔''

میں ''اچھا'' کہہ کر چپ ہو گیا۔

وہ صاحب ساقی فاروقی تھے۔

یہ بات 1956ء کے آس پاس کی ہے۔

ساقی بہت بڑے شاعر تھے۔ لندن میں آباد ہیں اور میرے گہرے دوست ہیں۔ ہاں تو نونہال کا شاندار سالنامہ نکلا۔ ادریس صدیقی نے اس میں شکوہ کے عنوان سے طویل نظم لکھی جس کی ابتداء کچھ ایسے مصرعوں سے ہوتی تھی:

شکوہ استاد سے خاکم بہ دہن ہے مجھ کو

اور آگے چل کر کچھ ایسے مصرعے آتے تھے:

نونہالان چمن آج بنے ہیں مرغا
جن کا ہے ملک و وطن آج بنے ہیں مرغا

بہت عرصے بعد میں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر بچوں کو یہ نظم گاتے سنا۔

ادریس صدیقی کو ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی۔ صابرہ نامی خاتون سے ان کی شادی کی بات پکی ہو گئی تو ان کی آنکھوں میں ستارے ناچنے لگے۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ بعد میں انہوں نے اردو تلفظ کے موضوع پر ایک کتاب لکھی، یہ ''مسائلِ تلفظ'' میرے پاس ایک نسخہ

تھا۔ کہیں کھو گیا۔ خود ادریس صدیقی بھی چل بسے۔

ادریس صاحب کا جانا ماہنامہ نونہال کے لیے ایک صدمہ تھا۔ اس دوران مجھے روز نامہ جنگ میں ملازمت مل گئی۔ حامد یار خان کے رسالے کو تیسرا بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب ہمدرد دواخانے کے حکیم سعید مرحوم نے ان کے خلاف بڑا دعویٰ دائر کر دیا۔ وہ خود ہمدرد نونہال کے نام سے بچوں کا رسالہ شائع کرتے تھے۔ انہیں گلہ تھا کہ حامد یار خان کے رسالے کا اصل نام ''نونہالِ پاکستان'' ہے لیکن یہ لفظ پاکستان چھوٹا سا اور نونہال بڑا سا لکھ کر یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کے رسالے کا نام نونہال ہے جو سراسر فریب ہے۔

مجھے پتا نہیں حکیم صاحب نے کتنے لاکھ روپے کا دعویٰ دائر کیا تھا البتہ مجھے یہ پتا ہے کہ حامد یار خان کے ناتواں گھٹنوں میں دم نہ تھا جو انہوں نے خاموشی سے ٹیک دیئے۔

وقت گزرتا گیا۔ میں صحافت کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا جنگ کراچی، جنگ راولپنڈی، حریت (فخر ماتری) اور مشرق کراچی سے ہوتا ہوا نیوز ایڈیٹر کا اعلیٰ منصب لے کر دوبارہ روز نامہ حریت میں شامل ہوا۔ اس وقت حریت کے مالکان معمولی لوگ نہیں بلکہ اخبار ڈان کے محمود ہارون اور یوسف ہارون جیسے صاحبِ ثروت تھے۔

حریت کے ایڈیٹر فرہاد زیدی تھے۔ میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے اخبار کے عملے کے ہر رکن سے فرداً فرداً ملنے گیا۔ جس کونے میں غریب پروف ریڈر بیٹھے تھے، دیکھا کہ حامد کانپوری بھی وہیں ایک گوشے میں بیٹھے اخبار کی پروف ریڈنگ کر رہے ہیں۔

اخبار کی سیڑھی پر سب سے نیچا پائیدان پروف ریڈر کا ہوتا ہے۔ اس سے نیچے خاک ہوتی ہے۔

---------O---------

مشقت شروع ہوتی ہے

مجھے اپنی پہلی باقاعدہ ملازمت کا برس یوں یاد ہے کہ اس سال 1857ء کی جنگِ آزادی کی صد سالہ یادگار منائی جارہی تھی اور ملازمت کے دن تاریخ اس لیے یاد ہیں کہ اسی روز سوویت یونین نے تاریخ کا پہلا مصنوعی سیارچہ اسپوتنک زمین کے گرد مدار پر بھیجا تھا اور اسی روز یعنی ماہ اکتوبر کے چوتھے روز ریڈیو پاکستان کی خبروں میں اسپوتنک سے موصول ہونے والے ریڈیائی سگنل بھی سنائے گئے تھے۔

ہوا یہ کہ روزنامہ جنگ میں اشتہار چھپا جس میں لکھا تھا کہ اخبار کے شعبۂ اشتہارات میں ایک آسامی ہے۔ تجربہ کار امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔ ماہنامہ نونہال کے دفتر سے روزنامہ جنگ کا دفتر بس اگلے ہی موڑ پر تھا۔ میں اپنے ناتجربہ کار ہونے کے باوجود درخواست لکھ کر وہاں دے آیا۔

دو چار روز بعد ہی مجھے انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ دفتر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر جو کمرہ تھا جس کے دروازے پر غالباً جنرل منیجر لکھا تھا، وہاں عرش تیموری صاحب بیٹھتے تھے۔ انہوں نے میرا انٹرویو لیا۔ میں بیس اکیس برس کا جوان، میں کیا جانوں انٹرویو کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھا وہ مجھ سے یوں ہی باتیں کر رہے ہیں۔ اُس سادگی اور لاپروائی کے ساتھ میری باتوں میں کچھ اعتماد سا رہا ہوگا کہ انہوں نے میرے منہ سے یہ سننے کے باوجود کہ میرا ترجمے کا تجربہ بس اتنا ہی ہے کہ امریکی کامِک سے ٹارزن کی کہانیاں اردو میں اتاری ہیں، مجھے ملازمت کی پیشکش کر دی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم دوستوں کی ٹولی امریکن فلمیں بہت شوق سے دیکھا کرتی تھی اور سینما کا ٹکٹ خریدنے کے لیے ہم ہفتہ بھر کے اخبار اور رسالے ایمپریس مارکیٹ کے سامنے صدر دواخانے کے قریب ایک کباڑی کے ہاتھ بیچا کرتے تھے۔ ایسے میں اپنے وقت کے اردو کے سب سے بڑے اخبار کے جنرل منیجر نے جب مجھے یہ نوید سنائی کہ مجھے دوسو روپے ماہانہ ملا کریں گے اور آگے چل کر یہ رقم بڑھا دی جائے گی، میرے لیے اپنی حیرت اور خوشی چھپانا مشکل ہو گیا۔

میرے دوست جو دفتر کے باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے، دوسو روپیوں کی خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑے کہ اب امریکی فلمیں دیکھنا کتنا آسان ہو جائے گا۔

اگلے روز میں ڈیوٹی پر جا پہنچا۔ مجھے شعبۂ اشتہارات دکھایا گیا جس میں دو میزیں اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک میز پر ایک صاحب بیٹھے اخبار میں شائع ہونے والے اشتہاروں کے بل بنا رہے تھے۔ دوسری میز خالی تھی جو مجھے سونپ دی گئی۔ اتنے بڑے اخبار کے دفتر کے ایک اندرونی کمرے میں جہاں قدرتی روشنی برائے نام اور برقی روشنی اس سے بھی کم تھی، میں خالی کرسی میں دھنس گیا اور اس کم سنی اور ناتجربہ کاری کے باوجود یہ بات مجھے حیران کر گئی کہ پاکستان کے اتنے بڑے اخبار کے شعبہ اشتہارات میں دس بارہ افراد کے عملے کے بجائے بس دو آدمی کام کرتے ہیں اور ان میں سے ایک کا کام بل بنانا، باقی سارا کا سارا بوجھ اُس دوسرے کے کاندھوں پر ہے جو دفتر میں کہیں بجنے والے ریڈیو پر سوویت سیارچے کے ریڈیائی سگنل سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اونچی اڑان کسے کہتے ہیں۔

کمرے میں بیٹھے دوسرے صاحب سرکار احمد تھے۔ جنگ کے پرانے ملازم تھے۔ اس لیے دوسرے اور چھوٹے ملازموں پر باآسانی حکم چلاتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ کام تیزی سے اور خاموشی سے کرتے تھے مگر جوں ہی اخبار کے مالک کے کمرے میں روشنی ہوتی تھی یعنی چپڑاسی دیکھ لیتے تھے کہ میر خلیل الرحمٰن آ رہے ہیں اور وہ لپک کر ان کے دفتر میں روشنی کر دیا کرتے تھے۔ بس اسی لمحے سرکار احمد کی خاموشی ٹوٹ جاتی تھی اور وہ بلند آواز سے چپڑاسیوں کو احکامات جاری کرنے لگتے تھے اور وہ بھی ایسے لب و لہجے میں گویا دفتر کا سارا بوجھ ان کی پیٹھ پر لدا ہے اور ان کی کمر پھوڑا ہوئی جا رہی ہے۔

میر صاحب کے جاتے ہی دفتر میں خاموشی چھا جاتی تھی اور برابر کی عمارت میں زچگی کی ماہر لیڈی ڈاکٹر کے لیبر روم سے زچاؤں کی چیخ و پکار دوبارہ سنائی دینے لگتی تھی۔

مجھے جو میز دی گئی اس کی کسی دراز میں تالا نہیں تھا۔ میں نے ایک ایک دراز کھول کر دیکھی۔ سب میں دواؤں کی خالی شیشیاں اور یا پھر بدخط ڈاکٹروں کے پرانے نسخے پڑے ہوئے تھے۔ یوں لگا جیسے دفتر کی فضا میں بیماریوں کی بو تیر رہی ہے کیونکہ عین سامنے والے کمرے میں، اخبار کے کیشیئر اطہر نفیس بیٹھا کرتے تھے اور ان کا حال یہ تھا کہ روز صبح ان سے پہلے کسی کمپاؤنڈر کے بنائے ہوئے لال اور ہرے مکسچر کی شیشیاں دفتر میں داخل ہوتی تھیں۔ کمرے میں ان کی پشت پر وہی شیشیاں قطار میں آراستہ ہوا کرتی تھیں اور میں سوچا کرتا تھا کہ ایسے بیمار شخص کے پاس دن بھر خواتین کے فون کیوں آتے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ شاعر بھی ہیں۔

جب مجھ پر کام کا بوجھ پڑا تو مجھے یقین ہوگیا کہ مجھے جن صاحب کی جگہ بٹھایا گیا ہے، وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہوں گے۔ تب کسی نے یہ بتا کر میرا حوصلہ بڑھایا کہ اس جگہ مطیع النبی صاحب کام کیا کرتے تھے۔ ان کی صحت اُن کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ جنگ کی نوکری کو خیر باد کہہ گئے۔

شاید عرش تیموری صاحب نے یہی دیکھ کر مجھے ملازمت دی ہوگی کہ بیس اکیس سال کا جوان ہے، دس بارہ برس نکال لے گا۔ مجھ پر تو صحافت کی دنیا میں داخل ہونے کی دھن سوار تھی مگر ہوا یہ کہ کام مجھ پر سوار ہوگیا، سندباد جہازی کے پیرِ تسمہ پا کی طرح۔

اوپر سے غضب یہ کہ کوئی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ سرکار احمد صاحب ان تمام مرحلوں سے گزر چکے تھے۔ کام سے خوب واقف تھے اور تجربہ کار تھے مگر وہ بھی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے سے گریز کرتے تھے جن سے بڑے بڑے کام آسان ہو جائیں۔

مثال کے طور پر اخبار میں روزانہ آٹھ دس بہت لمبے چوڑے ٹینڈر نوٹس ضرور چھپتے تھے۔ ان کی زبان جناتی اور بلا کی ٹیکنیکل ہوتی تھی۔ انہیں پڑھتے ہوئے اور ترجمے میں آنکھیں پھوڑتے ہوئے میرے آدھے سر میں درد ہونے لگتا۔ کسی نے مجھے نہیں بتایا کہ یہی ٹینڈر نوٹس اردو کے دوسرے اخباروں میں باری باری چھپتے ہیں۔ اتوار کو انجام میں، پیر کو امروز میں اور منگل کو جنگ میں۔ کسی نے یہ ترکیب نہیں سجھائی کہ دوسرے اخباروں پر نگاہ رکھو۔ اگر کہیں کوئی ٹینڈر نوٹس ایک دو دن پہلے چھپ گیا تو قینچی سے کاٹو اور کاتب کے ہاتھ میں تھما دو۔

کاتب اُس مخلوق کو کہتے تھے کہ اسے کیسا ہی جناتی مسودہ دے دیجیے وہ اپنی عادتِ ثانیہ کو کام میں لاتے ہوئے اُس کی کتابت کرتا چلا جائے گا اور اسے ہوش تک نہ ہوگا کہ نفسِ مضمون کیا

ہے، متن کیا ہے اور عبارت کیا ہے۔

ہر روز آٹھ صفحے، پہلے سے آخر تک تمام صفحوں پر اشتہار ہی اشتہار، لکس صابن سے لے کر ریلوے کے ٹینڈر نوٹس اور شہر کے تمام سینماؤں میں دکھائی جانے والی فلموں سے لے کر عدالت میں حاضری کے حکم تک بھانت بھانت کے اَن گنت اشتہار اور ان سب کو سمیٹنا، آراستہ کرنا، ترجمہ کرنا، کتابت کرانا، پروف پڑھنا اور آٹھوں صفحات پر اُن کو چسپاں کرنا۔ یہ سب اتنا مشکل نہیں تھا جتنا یہ خوف اور یہ اندیشہ کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اشتہار والے پیسے دینے سے انکار کر دیں گے۔ تلافی کے طور پر وہی اشتہار درست کر کے دوبارہ اور بلا معاوضہ چھاپنا پڑے گا اور اس سے بھی بڑھ کر چپڑاسی کے ہاتھوں آنے والا عرش تیموری صاحب کا پرچہ کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ کرنل کو کولونل لکھ دیا۔

رات کو گھر جا کر کسی طرح سو تو جاتا تھا مگر صبح اٹھتے ہی اخبار کی طرف دوڑتا تھا کہ الٰہی کوئی غلطی نہ ہوئی ہو۔

اعصاب یوں ٹوٹنے لگے کہ ان کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بینائی کمزور ہونے لگی اور وزن گرنے لگا۔ ٹینڈر نوٹس دوسرے اخباروں سے نقل کرنے کا راز میں نے خود ہی دریافت کیا اور اِس طرح میرے کام کا بوجھ ذرا سا ہلکا ہوا۔

سب سے ہلکا کام سینما کے اشتہاروں کا ہوتا تھا۔ شہر میں پچیس تیس سینما تھے اور ہر روز ہر ایک کا اشتہار چھپنا ضروری تھا کیونکہ لوگ ان ہی کو دیکھ کر فیصلہ کرتے تھے کہ کس سینما میں جا کر کون سی فلم دیکھی جائے۔

یہ کام یوں آسان تھا کہ ہمارے کرکٹ کے نامور مبصر منیر حسین صاحب نے اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول رکھی تھی اور اپنے سبھاؤ کی وجہ سے شہر کے سارے سینما مالکان کو شیشے میں اتار رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سینما گھروں کے سارے اشتہار یہی منیر صاحب کی ایجنسی جاری کرتی تھی۔ منیر صاحب خود اپنے قلم سے ان اشتہاروں کے مضمون لکھتے تھے۔ ان اشتہاروں کا پلندا لے کر ان کی کمپنی کے ہرکارے کہ نام جن کا عمر تھا، اپنی بائیسکل پر بیٹھ کر اور ہر اخبار کے دفتر میں جا کر وہ اشتہار پہنچاتے تھے۔

یہ کام کرتے کرتے عمر کو اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ اگر کبھی منیر صاحب اپنے بیٹوں کو کرکٹ ٹیم میں جگہ دلوانے کی کوشش میں مصروف ہوتے، عمر سارے اشتہار خود ہی لکھ لاتے۔ اس کا

مضمون آسان تھا۔ ''پبلک کے بے حد اصرار پر۔ شرطیہ نئی کاپی۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔ باب اینڈ سیلی صرف بالغان کے لیے۔'' بس یہ ضرور تھا کہ لاہور کے فلم سازوں نے چکنی چپڑی باتیں بنا کر میر خلیل الرحمان کے پیسے سے ایک فلم بنائی تھی۔ اس کا دو انچ سنگل کالم سے بڑھ کر چار انچ ڈبل کالم کا اشتہار منیر صاحب کے بجائے عمر نے لکھا۔ انہوں نے ''جنگ و آشتی'' کے بجائے ''جنگ و آتشی'' لکھ دیا۔ وہ اسی طرح چھپ گیا۔ اس بار عرش تیموری صاحب کا پرچہ نہیں آیا بلکہ میر صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں خوش تھا کہ مجھے برخاست کر دیں گے اور اِس روز روز کی صعوبت سے نجات ملے گی۔ وہ انہوں نے نہیں کیا بلکہ بہت نرمی سے کہا ''رضا صاحب، ذرا خیال رکھا کیجیے۔''

وہ مجھے ہمیشہ اِسی نام سے بلاتے تھے۔ ان کے بلانے میں اتنی ملائمت ہوتی تھی کہ مجھے بات کرنے کی جرأت ہوئی اور ایک روز موقع پا کر میں نے اُن سے کہہ دیا کہ ''میر صاحب، مجھے تو صحافی بننا ہے، نیوز روم میں کام کرنا ہے اور جنگ راولپنڈی میں جانا ہے۔''

کہنے لگے ''لوگ کراچی آ کر یہاں کام کرنا چاہتے ہیں، آپ راولپنڈی کیوں جانا چاہتے ہیں۔''

میرا جواب تیار تھا ''مجھے پہاڑ بہت اچھے لگتے ہیں۔''

یوں لگا جیسے وقت گزرنے سے انکاری ہو۔ ہفتے بھاری اور مہینے بوجھل ہوتے گئے۔ شعبۂ اشتہارات میں کوئی میرا ہاتھ بٹانے والا نہیں تھا۔ سرکار احمد جیسے تجربہ کار افسر اسی کمرے میں یوں بیٹھتے تھے جیسے دیوار بیٹھی ہو۔ آج پچاس پچپن سال بعد بھی مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے صرف ایک لفظ undersinged کا ترجمہ پوچھا تھا جو انہوں نے ''دستخط کنندہ ذیل'' بتایا تھا۔

ہاں ادارہ جنگ کے دو ملازموں نے مجھے سہارا دیا۔ ان میں ایک دفتر کی نیچے والی منزل کا چپڑاسی سلیمان تھا۔ وہ نوجوان بلوچ تھا۔ معمولی پڑھا لکھا تھا مگر بہت پھرتیلا اور دفتر کے معاملوں کو خوب سمجھنے والا تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ مجھ پر کام کا بے پناہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ جنگ کے سارے کاتب اوپر کی منزل میں بیٹھتے تھے اور ان کو اشتہار کے مسودے پہنچانا، کتابت شدہ اشتہار اصلاح کے لیے نیچے لانا اور غلطیاں درست کرنے کے لیے دوبارہ اوپر لے جانا، سوچتا ہوں کہ سلیمان نہ ہوتا تو میں ''شہیدِ جنگ'' کہلاتا۔

وہ جو سرکاری ٹینڈر نوٹس ہوتے تھے، مثلاً پاکستان ریلوے، محکمہ تعمیرات اور کراچی کی

بجلی کمپنی کے اطلاع نامے۔ ان سب کے اشتہاروں میں ان کا لوگو یا ٹریڈ مارک شامل کرنا ہوتا تھا۔ ان سب کے بلاک بنے ہوئے شعبہ اشتہارات کے پاس موجود ہوتے تھے۔ جس ادارے کا اشتہار ہوتا اس کے ٹریڈ مارک کا چربہ اٹھانا ہوتا تھا۔ اس پر سیاہی کا بیلن کیسے پھیرا جائے اور پھر اسے کتابت والے پیلے کاغذ پر کیونکر چھاپا جائے، یہ کام سلیمان کا تھا جو بڑی مستعدی سے انجام دیتا تھا۔ نیچے کی منزل کے دوسرے شعبوں کی خدمت بھی سلیمان ہی کے ذمے تھی اور کام کا بوجھ اس پر بھی کچھ کم نہ تھا، یہ چربے اٹھانے کا ہنر اُس نے مجھے بھی سکھا دیا اور یہ کام آسان ہو گیا۔

سلیمان کے ذمے ایک اور کام بھی تھا اور وہ تھا اخبار کے پرانے شمارے اور پرانے فائل ترتیب سے اور احتیاط سے رکھنا۔ نچلی منزل میں ایک دوچھتی تھی جس کی تاریکی میں پرانے شمارے اور فائل رکھے گئے تھے۔ کبھی کسی کو کسی پرانے شمارے کی ضرورت ہوتی تو وہ شمارہ سلیمان ہی نکال کر لاتا۔

ایک روز میں نے اسے بتایا کہ سنہ 52-51ء میں بچوں کے صفحے ''نونہال لیگ'' پر میری لکھی ہوئی کہانیاں بھی شائع ہوئی تھیں۔ میں نے تو یوں ہی تذکرہ کیا تھا اور تذکرہ کر کے میں بھول بھال گیا۔ ایک روز سلیمان میرے پاس آیا اور بولا کہ ذرا میرے ساتھ چلیے۔ وہ مجھے اسی تاریک دوچھتی میں لے گیا جہاں میں نے دیکھا کہ اس نے تین سال کے پرانے فائل نکال رکھے ہیں اور ان کے اندر اتوار کے ہر اُس اخبار کے لیے نشانی (بک مارک) لگائی ہوئی ہے جس میں میری لکھی ہوئی کوئی کہانی شائع ہوئی تھی۔

سلیمان کا خیال تھا کہ میں خوشی سے اچھل پڑوں گا اور اسے گلے لگا لوں گا۔ میں نے ایک نگاہ ڈالی۔ ''کلرک کی عید۔ ماں کی خدمت۔ غریب کا بیٹا۔'' کچھ اس قسم کے عنوان پڑھ کر میں نے پرانے اخباروں کے وہ فائل بند کر دیئے اور سلیمان سے کہا کہ یہ قصے پرانے ہو گئے۔ یہ فائل واپس ان کی جگہ جما دو۔ اب خدا جانے وہ کیسا ہو گا، کہاں ہو گا۔ ہو گا بھی یا نہیں۔

میرے دوسرے مددگار کا احوال بھی سن لیجیے۔ وہ پیارے تھے۔ مجھے ان کا اصل نام کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ دنیا انہیں پیارے کے نام سے جانتی تھی۔ پیارے یوں تو کاتب تھے لیکن خبریں، سرخیاں، اشتہار اور تصویریں چپکا کر اخبار کے صفحوں کو ان کی شکل دینے کا کام پیارے کے ذمے تھا۔ کتابت تو وہ دو دو انچ کے سینما کے اشتہاروں کی کرتے تھے، باقی وقت کھڑے کھڑے اُس صفحے پر خبریں وغیرہ چپکاتے تھے جو اخباری اصطلاح میں کاپی کہلاتا تھا۔ اندر کی کاپی،

اداریے کی کاپی، دن کی کاپی، رات کی آخری کاپی، یہ روزمرّہ کی اصطلاح تھی۔

پیارے نے کاپی میں اشتہار چپکانے کے گُر سکھائے۔ سارے اشتہار سلائی یا فولڈ کی طرف سے چپکنا شروع ہوتے تھے اور ڈھلان کی شکل میں آراستہ ہوتے تھے۔ عام اور معمولی اشتہار پیچھے اور نیچے کی طرف لگتے تھے اور بہتر یا قیمتی اشتہار ڈھلان میں باہر یا اوپر کی طرف چپکائے جاتے تھے۔ یہ قیمتی اشتہار بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے خوبصورت اشتہار ہوتے جو ''ڈسپلے'' کے اشتہار کہلاتے تھے۔ لکس صابن سے لے کر پی آئی اے تک اس طرح کے اشتہار ایجنسی ہی سے کتابت کے پیلے کاغذ پر چربے کی شکل میں آتے تھے۔ کبھی کبھار ڈسپلے کے ان اشتہاروں کی کاپی انگریزی میں آتی تھی۔ ان کا ترجمہ خود عرش تیموری صاحب کرتے تھے اور اچھے خوش نویسوں سے ان کی کتابت کرائی جاتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تیموری صاحب نہایت عمدہ، نفیس اور رواں ترجمہ کرتے تھے۔ تبھی تو لوگ انہیں خاندانِ مغلیہ کا آخری چشم و چراغ کہتے تھے۔

---------O---------
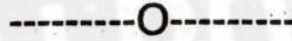
مجھے پہاڑ پسند ہیں

جنگ کی ملازمت کا ایک بڑا فائدہ ہوا۔

دو نہایت شریف النفس افراد سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک عرش تیموری تھے۔ شانتی نکیتن کے تعلیم یافتہ، بلا کے ذہین، خوش لباس، خوش مزاج اور دہلی کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اولاد۔ تیکھا ناک نقشہ، مغل روپ رنگ، اتنے دبلے پتلے کہ ہر سوٹ بدن پر ڈھیلا ڈھالا لگے۔ عمر کے معاملے میں ان کا بدن چور تھا۔ نہیں معلوم کتنے بڑے تھے۔ مزاج میں بلا کی نفاست اور وضع داری تھی۔ میری بڑی سے بڑی غلطی پر بھی کبھی مجھے اپنے کمرے میں نہیں بلایا اور نہ خود میرے پاس آئے کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنی ہوگی۔ ہمیشہ سلیمان کے ہاتھ ایک کاغذ کا پرزہ بھیجتے تھے ”رضا صاحب، یہ اشتہار غلط چھپ گیا ہے۔“ کبھی یہ نہیں لکھا کہ آپ نے غلط چھاپا ہے۔

حیرت ہے کہ ان کے دوست احباب اور عزیز و اقارب نے انہیں گمنام رکھا۔ انٹرنیٹ اور وکی پیڈیا میں کسی نے ان کا احوال درج نہیں کرایا۔ کسی زمانے میں انہوں نے چھوٹی سی کتاب ”قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں“ لکھی ہوگی اور شانتی نکیتن کے مجلّے میں رومی کی شاعری پر مقالہ لکھا ہوگا، بس انٹرنیٹ پر اس کا ذکر ہے۔ دوسری شریف النفس شخصیت کا ذکر ذرا دیر بعد آئے گا۔

دوبارہ شعبۂ اشتہارات کا ذکر۔

چونکہ میرے زیادہ تر اشتہاروں کی کتابت ہوتی تھی، کاتبوں سے میں نے ہمیشہ اچھے تعلقات رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بھی میرا بہت خیال رکھا۔ ہر ایک سے میری ذاتی دوستی

تھی۔ اپنے معاملوں اور مسئلوں میں مجھے شریک رکھتے تھے اور مجھ پر پڑے ہوئے کام کے بوجھ کو خوب سمجھتے تھے۔

کبھی کبھی ان پر بھی مصروفیت کا دورہ پڑتا تھا ہر چند کہ اس میں ان کا کچھ بھلا بھی ہو جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ ووٹروں کی فہرستیں کتابت کے لیے آئیں۔ چند روز کے اندر انہیں ہزاروں صفحوں کی کتابت کرنی ہوتی تھی۔ اپنے فالتو وقت میں وہ رات بھر جاگ کر کتابت کرتے تھے۔ کئی کئی روز گھر نہیں جاتے تھے اور کھانا پینا بھی وہیں دفتر میں کرتے تھے۔

ایک بار یوں ہوا کہ مشہور سوویت مصنف الیگزانڈر سولژے نیت سین کا شہرۂ آفاق ناول ''گولاگ آرکی پولاگو'' چوری چھپے امریکہ پہنچ گیا۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ ناول سوویت یونین کے بیگار کیمپوں کے اندر کی کہانی سناتا ہے۔ امریکیوں کے ہاتھ گویا نعمت لگی اور انہوں نے یہ کتاب راتوں رات دنیا کی تقریباً ہر زبان میں چھپوانے کی ٹھان لی۔

بس پھر کیا تھا ساری دنیا میں امریکی سفارت خانے حرکت میں آ گئے۔ یوں لگا کہ ایک بھاری بھرکم مشین تیزی سے چل پڑی۔ کراچی میں امریکی سفارت خانے نے روزنامہ جنگ کے نیوز ایڈیٹر یوسف صدیقی کی خدمات حاصل کیں۔ ان کے ہاتھ میں رقم رکھی اور کہا کہ یہ کتاب اردو میں ترجمہ کر کے راتوں رات چھاپ دو۔

یوسف صدیقی نے کتاب کے سارے ورق کھولے اور نیوز روم کے عملے، خصوصاً ترجمہ کرنے والوں میں تقسیم کر دیئے۔ کاتبوں کو للکارا کہ وہ اپنے قلم پر دھار بٹھائیں اور پھر تو ترجمے اور کتابت کی مشین یوں چل پڑی جیسے دُھنیا منوں روئی رات بھر میں دُھن ڈالنے کی دُھن میں لگا ہو۔

چند روز میں گولاگ کا اردو ترجمہ بازار میں آ گیا۔ یوسف صدیقی، انعام عزیز اور دوسرے ساتھیوں نے وکٹوریا میں بیٹھ کر اور کلفٹن جا کر اس کامیابی کا جشن ضرور منایا ہوگا۔

اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، ہمارے کاتبوں کا بھی بھلا ہو گیا اور ان کی جیبوں میں بھی دو چار ڈالر آئے۔

ادارہ جنگ میں ہیڈ کاتب الیاس صاحب تھے۔ ان سمیت یہ سارے کے سارے کاتب دلّی کے انداز میں کتابت کرتے تھے جو لاہور کے انداز سے مختلف ہوتی تھی۔ لاہور کی کتابت دیکھنے میں یوں نظر آتی تھی جیسے ذرا ترچھی تحریر تیزی سے لکھی گئی ہو۔ اس کے برعکس دلّی

کے قلم میں نہ صرف ٹھہراؤ تھا بلکہ اس کے کش اور دائرے برابر سے ایک جیسے اور صحیح معنوں میں یکساں ہوتے تھے۔ آگے چل کر جب یہ معجزہ رونما ہوا کہ کاتب کی بجائے کمپیوٹر یہ کام کرنے لگا اور کمپیوٹر کی کتابت نوری نستعلیق کہلائی تو اس کا خط یہی دہلوی تھا جو اب ساری دنیا میں رائج ہے۔

الیاس صاحب کا نہ صرف یہ کہ خط بہت اچھا تھا بلکہ مزاج دھیما تھا۔ خوش اخلاق تھے اور ہیڈ کاتب ہونے کی مناسبت سے سارا کام کاتبوں میں تقسیم کرنے کا فرض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ اخبار کی بڑی سرخیاں وہ خود لکھتے تھے۔ یوں بھی ہر کاتب اپنی خوبی کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ کوئی باریک کتابت اچھی کرتا تھا، کوئی سرخیاں اچھی لکھتا تھا اور کوئی ٹینڈر نوٹس جیسے اشتہار لکھنے میں جھونک دیا جاتا تھا۔

ہر اردو اخبار میں خدا جھوٹ نہ بلوائے پچیس تیس کاتب ضرور ملازم ہوتے تھے۔ جنگ کے کاتبوں کی ٹیم کے اندر کچھ بٹوارے تھے تو کبھی نظر نہیں آئے۔ کبھی کسی کے ہاں کوئی تقریب ہوئی تو سب کے لیے مٹھائی، چائے یا کھانا ضرور آتا تھا۔

ایک قاضی جی تھے۔ ضعیف، کمزور اور بیمار۔ اکثر کھانستے رہتے تھے۔ ان کا مزاج غضب کا بلغمی تھا مگر یہ میر خلیل الرحمان کی خوبی تھی کہ جب تک ممکن ہوا، قاضی جی برسر روزگار رہے۔ ان کا بیٹا بڑا ہو کر پہلے کاتب ہوا، پھر اخباری فوٹو گرافر ہو گیا۔

ایک حافظ صاحب تھے۔ وہ بھی ضعیف لیکن دیکھنے میں توانا تھے۔ بڑی سی سفید داڑھی تھی مگر سیدھے چلتے تھے۔ خوش مزاج تھے اور ہنستے تھے تو چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ دوسرے کاتب اس وقت بہت جلے جب انہیں معلوم ہوا کہ حافظ صاحب ایک نوجوان دلہن بیاہ لائے ہیں۔ نسبتاً جوان کاتب انہیں چھیڑنے لگے اور دعوت کا مطالبہ کرنے لگے۔ حافظ صاحب مان گئے۔ جنگ کے دفتر کی چھت پر دریاں بچھیں اور بڑا کھانا ہوا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس دعوت میں صرف کاتب ہی نہیں بلکہ عملے کے تمام سینئر افراد بھی شریک تھے۔ ان میں اپنے وقت کے بڑے شاعر رئیس امروہوی بھی تھے جن سے کاتبوں کی فرمائش تھی کہ وہ حافظ صاحب کا سہرا کہیں۔

میں نے وہ منظر خود نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ رئیس امروہوی کا لکھا ہوا سہرا کسی شریر لڑکے کی تحریر معلوم ہوتا تھا۔ جب تک وہ سہرا پڑھتے رہے، حاضرین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ ان کا ایک شعر مجھے یاد ہے جو علامتی شاعری کا شاہکار تھا۔ اس میں کچھ دیرینہ قلم کا ذکر تھا اور کچھ تازہ دوات کا۔

جنگ کے دفتر میں آنے جانے والے کچھ کردار اور بھی تھے۔

صابر تنومند جوان تھے اور میر صاحب کے اُن دنوں کے رفیق تھے جب دفتر کی محنت مزدوری کے فرائض بھی میر صاحب اپنے ہاتھوں انجام دیتے تھے۔ اس وقت صابر ہی ان کے نائب تھے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ صابر ہر صبح سائیکل پر بیٹھ کر دفتر آتے۔ میر صاحب اسی سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کر آتے تھے۔ دونوں مل کر اخبار کے بنڈل باندھتے تھے جو نہ صرف شہر کے مختلف مقامات بلکہ ملک کے دوسرے علاقوں کو بھیجے جاتے تھے۔ صابر کو میں نے جب تک دیکھا محنت کرتے ہی دیکھا۔ دفتر میں اُن کی نہ کوئی میز تھی اور نہ کرسی۔

ایک اور وفادار بشیر ڈرائیور تھا۔ چاندی جیسے بال، ڈھلتی ہوئی عمر لیکن اس پر بلا کا اعتبار تھا۔ میر صاحب کے کمسن بیٹوں اور بیٹیوں کو اسکول لانے لے جانے کا کام وہی انجام دیتا تھا۔ کبھی کبھی نوعمر جاوید الرحمان، شکیل الرحمان اور ان کی دو بہنیں اسکول سے فارغ ہو کر جنگ کے دفتر آ جاتی تھیں۔ یہ بچے دیر تک برنس روڈ پر دفتر کی بڑی دہلیز پر کھیلتے رہتے تھے۔

آتا جاتا ایک اور کردار شام کے اخبار مسلمان کے ایڈیٹر اور مالک تھے جنہیں سب دادا عشرت کہتے تھے۔ اخبار میں ان کا نام عشرت علی چھپتا تھا۔ اکثر مسکراتے رہتے تھے تو ان کے سونے کے دانت جھلملاتے تھے۔ روزنامہ مسلمان کا دفتر چند قدم کے فاصلے پر تھا مگر مجھے یہ نہیں پتا کہ وہ جنگ کے دفتر کیوں آتے تھے۔ صرف یہ ضرور سننے میں آتا تھا کہ میر صاحب ان پر بہت مہربان تھے۔

مجھے مہینے کے مہینے آنے والی وہ برقعہ پوش عورتیں یاد ہیں جو غریب بیوہ یا ضرورت مند تھیں۔ غالباً ان کی رقم بندھی ہوئی تھی۔ وہ جنگ کے کیشیئر اطہر نفیس کے کمرے میں داخل ہوتی تھیں اور کسی جگہ انگوٹھے کا نشان لگا کر اپنے حصے کی امداد لے جاتی تھیں۔ کون تھیں، کہاں سے آتی تھیں، کہاں جاتی تھیں اس کی کبھی کوئی تشہیر نہیں کی جاتی تھی۔ ایک ہاتھ دیتا تھا، دوسرا ہاتھ بے خبر تھا۔

اور اب میں آتا ہوں ادارہ جنگ کے دوسرے شریف النفس انسان کی طرف اور وہ تھے اخبار کے بانی میر خلیل الرحمان۔ ان کے بارے میں ہزار لوگ ہزار طرح کی باتیں کرتے ہوں گے مگر میں نے انہیں انسان دوست اور دردمند دِل کا مالک پایا۔ ان کی طبیعت میں بلا کا دھیما پن اور ملائمت تھی۔ دفتر میں آتے تھے تو قدموں کی چاپ نہیں ہوتی تھی۔ ان کے کمرے کی بتی روشن

ہو جاتی تھی جس کا مطلب تھا کہ میر صاحب آ گئے ہیں۔

میر صاحب کی ایک خوبی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ بعض اوقات ادارے کے ملازم ان سے لڑ جھگڑ کر اور انہیں برا بھلا کہتے ہوئے نوکری چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور پھر اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد واپس آتے تھے اور میر صاحب انہیں دوبارہ ملازمت دے دیتے تھے۔ یہ قصہ بار بار دہرایا گیا۔

میرا قصہ ذرا سا مختلف تھا۔ ہوا یہ کہ میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ انٹر کا امتحان تو میں نے جیسے تیسے پاس کر لیا تھا لیکن بی اے کا امتحان اُن دنوں آ پہنچا جب میری جنگ میں ملازمت پختہ ہو چلی تھی۔ میں نے چاہا کہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر امتحان کی تیاری کروں اور اس سے فارغ ہو کر واپس آ جاؤں۔

میں نے ادارے میں دونوں شریف النفس افراد سے بات کی۔ عرش تیموری صاحب اور میر صاحب کو بی اے کا امتحان دینے کا خیال پسند آیا اور دونوں ہی نے میری رخصت منظور کر لی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ مطیع النبی صاحب جو بیمار ہو گئے تھے اور جن کی جگہ مجھے رکھا گیا وہ صحت یاب ہو رہے ہیں اور اپنے کام پر واپس آنا چاہتے ہیں۔ میر صاحب کی دردمندی ان کے کام آئی۔ میں امتحان کی تیاری کے لیے چلا گیا۔ البتہ چلتے چلتے میر صاحب سے کہتا گیا ''مجھے راولپنڈی جانا ہے۔'' وہ مسکرا کر چپ ہو گئے۔ اِس بار انہیں معلوم تھا کہ مجھے پہاڑ پسند ہیں۔

میں امتحان سے فارغ ہو کر میر صاحب کے پاس پہنچا۔ مجھے احساس تھا کہ شعبۂ اشتہارات میں میری جگہ اب خالی نہیں ہے۔

یہاں میر صاحب کی فراست کا میں قائل ہو گیا۔ کہنے لگے کہ اب آپ سرکولیشن میں کام کر لیجیے۔ بس یہ ضرور ہے کہ وہاں کام کم اور محنت تھوڑی ہے۔ اس لیے آپ کو ہر مہینے دو سو روپے کی بجائے ڈیڑھ سو روپے ملیں گے۔

میں اُس شعبے میں چلا گیا جو ہر صبح اخبار کی تقسیم کا بندوبست کرتا ہے اور ہر مہینے اخبار فروشوں کو مہینے بھر کا حساب بنا کر بل بھیجتا ہے۔ اِس شعبے کے سربراہ سرکار حسن صاحب تھے۔ پہلے والے سرکار صاحب سے بالکل مختلف۔ انہوں نے سارا کام ذرا دیر میں سمجھا دیا اور وہ بھی اس خوش اسلوبی سے کہ مجھے ہر مہینے پچاس روپے کے خسارے کا ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوا۔

سرکار حسن صاحب اب تک یہ سارا کام تنہا ہی کر رہے تھے اور اس میں انہیں اتنی

مہارت تھی کہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں کسی مددگار کی ضرورت نہ تھی۔

اس جگہ آ کر مجھے ایک نیا کام ملا۔ روز کی ڈاک وصول کرنا اور یہ سارے خط متعلقہ لوگوں یا شعبوں کو پہنچانا۔ عجب بات یہ ہے کہ اکثر خط میر خلیل الرحمان صاحب کے نام ہوتے تھے۔ میں بڑی سعادت مندی سے ان کے خط ان کے حوالے کر دیتا۔ اب مجھے ایک دلچسپ مصروفیت سونپی گئی۔ جو خط ذاتی نوعیت کے ہوتے تھے ان کے جواب میر صاحب اپنے ہاتھ سے لکھتے، البتہ روزانہ آنے والے عام خطوں کا جواب مجھ سے لکھواتے۔

کسی اخبار کے مالک کا قرب حاصل کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا مگر میں نے اپنی لکیر کبھی پار نہیں کی۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ میں اخبار نویس بننا چاہتا ہوں۔

میر صاحب کو اچھی طرح اندازہ تھا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ہر سال کے معمول کے مطابق ادارے کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے لیے آڈیٹر آ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکاؤنٹس کے شعبے کے نگران اور ان کا مددگار آڈیٹروں کو حسابات دکھانے میں مصروف ہو گئے۔ اب وہاں روز کے حساب کے اندراج کے لیے ایک آدمی کی ضرورت پڑی۔ میر صاحب نے مجھے اُس کمرے سے اٹھایا جس کے دروازے پر لفظ ''سرکولیشن'' لکھا تھا اور اس کیبن میں بٹھا دیا جس کی پیشانی پر ''محتسب'' لکھا تھا۔ میں اچانک اکاؤنٹینٹ بن گیا۔

میر صاحب بھی خوب تھے۔ مجھے اِدھر اُدھر بٹھانے کے یہ محض حیلے تھے۔ اوپر کی منزل میں نیوز روم سے ایک جونیئر صاحب جو دن کی شفٹ میں مترجم اور پروف ریڈر تھے، اپنی ملازمت چھوڑ کر ولایت جا رہے تھے۔ میر صاحب اُن کے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک صبح دفتر آ کر اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میر خلیل الرحمان میرے کیبن میں آئے اور بولے ''رضا صاحب، ذرا میرے ساتھ آئیے۔''

---------O---------

میری پیٹھ پر پہلی تھپکی

وہی زینہ جس پر چڑھ کر میں صبح و شام کاتبوں کو اشتہاروں کے مسودے دینے جایا کرتا تھا، اسی زینے پر میں نئی دھج کے ساتھ چڑھ رہا تھا۔ آج میں صحافت کی رہگزر پر پہلا قدم رکھنے جا رہا تھا۔ رہگزر میرے ساتھ تو تھی مگر یہ کہاں تک جاتی تھی، یہ کتنی پر پیچ ہے اور اس میں کتنے نشیب و فراز ہیں، سب کچھ میری نظروں سے اوجھل تھا۔

میرا کیا بنے گا؟ مستقبل کے اخبار نویس کو ساری خبریں تھیں، بس یہی ایک خبر نہ تھی۔

نازش حیدری میرے منتظر تھے۔ ہم ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔ اس لیے نہ اجنبی ہونے کا احساس تھا اور نہ نو وارد اور مبتدی ماتحت ہونے کا تصور تھا۔ دعا سلام ہوئے۔ میرے سامنے انگریزی میں لکھی ہوئی خبروں کا پلندہ رکھ دیا گیا۔ میں نے جیب سے قلم نکالا اور روزمرہ کی زبان میں "شروع" ہو گیا۔

میر صاحب نے اپنے کمرے میں جا کر یہ مژدہ نہیں سنایا کہ اب آپ اوپر جا کر نیوز روم میں کام کریں گے بلکہ یہ خبر سنائی کہ وہ میرے کام اور خصوصاً میرے ترجمے میں میرا ہاتھ بٹائیں گے اور اس کا طریقہ انہوں نے یوں سمجھایا "رضا صاحب، آپ روز صبح اخبار میں اپنی ترجمہ کی ہوئی خبروں پر لال پنسل سے نشان لگا کر میری میز پر رکھ دیا کیجیے۔"

میں اپنے صحافی بننے کی خبر میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اپنے تازہ تازہ استاد کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔ میر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ میری ترجمہ کی ہوئی خبریں دیکھنے کے بعد کیا کریں گے۔ میری رہنمائی کریں گے یا میری ملازمت جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کریں گے۔

ملازمت کی طرف سے مجھے یوں اندیشہ نہیں تھا کہ بچپن سے آج تک اخبار غور سے پڑھے تھے۔ اخباری زبان میرے مزاج کا حصہ بن چکی تھی اور خود پر اعتماد بہت تھا۔

دوسرے یہ کہ مجھے اندازہ تھا کہ جنگ کے راولپنڈی ایڈیشن کے عملے کی بھرتی شروع ہو چکی ہے اور دو افراد کا تقرر ہو چکا ہے۔ ایک شوکت تھانوی اور دوسرے رضا علی۔

میرے پہلے باس نازش حیدری تھے۔ اب بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ وہی پرانے لوگوں جیسی وضع قطع اوپر سے شاعروں جیسا انداز اور مزاج، نرم گفتار، شفیق، لطیفہ گو اور ہنس مکھ۔ نازش حیدری اور مولانا حسن ندوی، یہ دو بزرگ میں نے ایسے دیکھے جو بڑوں میں بیٹھ کر بڑے اور چھوٹے میں بیٹھ کر ان ہی جیسے بن جاتے تھے۔ نازش حیدری کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ فوج میں رہ چکے تھے اور دوسری عالمی جنگ میں عراق کے محاذ پر جا چکے تھے۔ وہ فوج کے اس شعبے سے وابستہ تھے جو سگنلز کہلاتا ہے اور وائرلیس پر پیغامات بھیجا کرتا ہے۔ ہمارا یہ شاعر ذرا تصور کیجیے تار برقی کے پیغامات بھیجتا ہوگا۔

وہ اپنے فوجی ہونے کے قصے بہت مزے لے لے کر سناتے تھے۔ جس روز عراق کے محاذ پر پہنچے اُسی روز دشمن نے ان پر گولہ باری کی۔ شاعر تو کہیں بھی شعر گوئی سے باز نہیں آتا، نازش صاحب نے شعر کہا۔

کھائے آ کر عراق میں گولے
سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے

سگنلز والوں کو خندقوں اور بنکروں میں بٹھا دیا گیا۔ کام کاج کچھ تھا نہیں۔ چنانچہ بتانے لگے "ہم بیکار بیٹھے بیٹھے مورس کوڈ پر پیغامات کے بجائے ہندوستانی گالیاں بھیجتے رہتے تھے۔ دشمن پریشان ہو کر اپنے بال نوچتا ہوگا کہ یہ کیسے پیغامات ہیں جن میں مسلسل ماں بہن کی تکرار ہوتی ہے۔"

نازش حیدری کہنہ مشق شاعر تھے۔ مشاعروں میں پڑھتے ہوں گے مگر مجھے کبھی سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مجھے ان کا صرف ایک شعر یاد ہے۔ اس کا بھی ایک قصہ ہے۔ ہوا یہ کہ ہمارے شعبے کا پٹھان چپڑاسی میاں جان ایک روز کام پر نہیں آیا اور ہمیں اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں کرنے پڑے۔ اس پر نازش صاحب نے شعر کہا۔

غیر حاضر ہے میاں جان بڑی مشکل ہے
اس کا بھی کیجیے سامان بڑی مشکل ہے

مجھے یاد ہے اس پر میں نے بھی ایک شعر کاغذ پر لکھ کر ناز ش صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

لطف کھانے کا کئی روز سے آیا ہی نہیں
ماش کی دال کا فقدان بڑی مشکل ہے

ناز ش صاحب نے میرے پرچے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ وہ میری زندگی کا پہلا اور آخری شعر تھا۔

ماش کی دال پر یاد آیا کہ اخبار کے شعبۂ اشتہارات کے برعکس نیوز روم کی دن کی شفٹ میں ایک آرام یہ تھا کہ میں دوپہر کے کھانے کے لیے تھوڑی ہی دور پر ہمدرد دواخانے کے پہلو میں دہلی مسلم ہوٹل میں چلا جاتا تھا جہاں ماش کی دال اور دیگ کا قورمہ اچھا خاصا لذیذ ملتا تھا۔ دوپہر کے وقت ہوٹل کا بڑا اسا دالان علاقے کے بابوؤں اور کلرکوں سے بھرا رہتا تھا۔ اکثر لوگ اس ہوٹل کا قورمہ اور باریک چپاتیاں کھانے آتے تھے۔ چنانچہ بیرے آپ سے یہ پوچھے بغیر کہ آپ کیا کھائیں گے، آپ کے سامنے قورمہ اور چپاتیاں رکھ جاتے تھے۔ ہر شخص اپنا کھانا شروع کرنے سے پہلے دوسرے لوگوں سے یہ ضرور کہتا تھا کہ آئیے کھانا کھائیے۔ ظاہر ہے دوسرے لوگ خود اپنے کھانے کا انتظار کر رہے ہوتے تھے البتہ ایک ایسے صاحب باقاعدگی سے آتے تھے کہ جوں ہی انہیں کھانے کی پیشکش کی جاتی تھی، وہ بسم اللہ کہہ کر کھانے میں شریک ہو جاتے تھے۔ مجبوراً بیچارہ میزبان اور قورمے چپاتی کا آرڈر دیتا تھا۔ کہنے کو قورمے کی پلیٹ ایک روپے میں اور باریک چپاتی آٹھ آنے میں آتی تھی مگر ڈیڑھ سو روپے ماہوار کمانے والے کلرک کے لیے سودا کچھ سستا نہ تھا۔

بات چونکہ روزی کے کمانے کی ہو رہی ہے، اس لیے دوپہر کے کھانے کا ذکر کچھ ایسا بے جا تو نہیں۔

اس وقت قسمت نے میری پیٹھ پر پہلی تھپکی دی۔

ناز ش حیدری صاحب نے ترجمے کے لیے مجھے ایک پریس ریلیز دی جو امریکی سفارت خانے سے جاری ہوئی تھی۔ اس میں خاصی تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ روس افغانستان میں اور خصوصاً پاکستان کی سرحد کے قریب جدید سڑکوں کا جال بچھا رہا ہے اور ہوائی اڈے اور پل وغیرہ تعمیر کر رہا ہے۔ خبر اہم ہی نہیں سچ بھی تھی۔ یہ بات سن 1959ء کی ہے۔

ناز ش صاحب نے یہ امریکی پریس ریلیز میرے حوالے کی اور میں نے ذرا دیر میں

اس کا ترجمہ کر ڈالا اور وہ بھی خالص اخباری زبان میں البتہ نوآموز ہونے کے باوجود یہ احساس مجھے ستاتا رہا کہ دیکھنے میں یہ خاصی بڑی اور اہم خبر ہے۔ لاڑکانہ، ٹنڈو اللہ یار اور میرپور خاص کی خبروں کے قریب لگے گی تو عجیب بے ڈھب سی بات ہوگی۔ نازش صاحب نے یہ ضرور کیا کہ اہم خبروں پر دو کالم کی سرخی جماتے تھے۔ اس خبر پر تین کالم کی سرخیاں لگا کر اسے اپنے اندر کے صفحے پر سب سے اوپر لگوایا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ دن کی شفٹ (یعنی میں اور نازش حیدری) اپنے صفحات کو آخری شکل دے کر گھروں کو چلے گئے اور رات کی شفٹ والے کام پر آ گئے جنہیں میں نے نہایت مرعوب ملازم کی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ اصل صحافی رات کی شفٹ ہی میں کام کیا کرتے تھے۔

انعام عزیز اُس شفٹ کے انچارج تھے۔ رات کے دوران نہ جانے کس وقت انہیں محسوس ہوا کہ اس روز کی سب سے بڑی خبر اندر کے صفحے پر چپکا دی گئی ہے۔ انہوں نے وہ خبر وہاں سے اٹھائی اور اپنی بھڑکتی ہوئی سرخیاں لگا کر پہلے صفحے کی پیشانی پر چسپاں کر دی۔ اسے اخباری زبان میں اس روز کی Lead یا شہ سرخی کہا جاتا ہے۔

صبح کو جب اخبار آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری ترجمہ کی ہوئی خبر سب سے نمایاں مقام پر لگی ہے اور اس کا ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ میر خلیل الرحمان کی ہدایت کے مطابق میں نے نہایت فخر کے ساتھ اس پر اور اپنی ترجمہ کی ہوئی دوسری خبروں پر سرخ پنسل سے نشان لگائے۔ سینہ تان کر ان کے کمرے میں گیا اور میز پر اخبار یوں آراستہ کیا کہ کہیں ٹیڑھا نہ ہو اور ترچھا نہ ہو۔

میر صاحب مجھے بھیج رہے ہوں یا نہ بھیج رہے ہوں، مری، نتھیا گلی اور ایبٹ آباد کے پہاڑ مجھے ضرور بلا رہے تھے۔

یہ وہ دن تھے جب اخبار جنگ اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں روزنامہ انجام پیچھے رہا جا رہا تھا۔ جنگ کی اُس پرواز میں کوئی مانے یا نہ مانے ایک جونیئر نامہ نگار کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کا نام حبیب الرحمان تھا جو سنا ہے کہ آزاد کشمیر کے علاقہ میرپور کے کسی پرائمری اسکول کا معمولی سا استاد تھا۔

میں نہیں جانتا کہ اس نے صحافت اور جنگ کے میدان میں قدم کیسے رکھا لیکن پھر ہوا یہ کہ اس نے جنگ بندی لائن کے پار کی خبریں کراچی بھیجنی شروع کیں۔ اس وقت اخبار کے نیوز

ایڈیٹر یوسف صدیقی تھے جنہیں خبر کی سرخیاں لگانے کا ہنر خوب آتا تھا۔ خصوصاً اخبار کی پیشانی پر چھپنے والی شہ سرخی کے الفاظ وہ بڑے سلیقے سے جماتے تھے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ بھارت کے زیر قبضہ کشمیر کی خبریں تسلسل سے شہ سرخی بننے لگیں اور نہ صرف اخبار بلکہ نامہ نگار بھی غیر معمولی شہرت پانے لگا۔

حبیب الرحمان (جن کا خلیل الرحمان سے کوئی تعلق نہیں) رپورٹنگ کرتے کرتے راولپنڈی میں سرگرم ہو گئے۔ اس وقت یہ افواہ نئی نئی تھی کہ حاکم وقت ایوب خان ملک کا دارالحکومت کراچی سے اٹھا کر راولپنڈی کے قریب لانے کی سوچ رہے ہیں۔

ایک روز یہ ہوا کہ ہوائی اڈے پر ایوب خان اور حبیب الرحمان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ حبیب نے ان سے سوال کیا کہ دارالحکومت تبدیل کرنے کی بات کہاں تک پہنچی؟ ایوب خان نے صرف اتنا کہا کہ کابینہ اس پر غور کر رہی ہے۔

اگلی صبح اس خبر نے دھوم مچا دی۔ کراچی کی بساط لپیٹے جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لوگوں کا سارا دھیان مارگلہ کی پہاڑیوں اور شہر راولپنڈی کے درمیان خالی پڑے ہوئے ٹیلوں، میدانوں اور پہاڑی نالوں پر مرکوز ہو گیا جہاں ایک شاندار شہر بسانے کے سارے امکانات موجود تھے۔

اپنا مال اسباب اٹھا کر اس خواب جیسے نئے دارالحکومت پہنچ جانے کی پہلے پہل تعبیر دیکھنے والوں میں میر خلیل الرحمان کا نام سرفہرست ہے۔ نیا شہر کس میدان اور کس وادی میں بنے گا، اس کا انتظار کیے بغیر میر صاحب نے جنگ کا ایک ایڈیشن راولپنڈی سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہی جونیئر رپورٹر حبیب الرحمان راتوں رات سینئر صحافی بن گیا اور دیکھتے دیکھتے اس نے اتنا اثر قائم کر لیا کہ میر صاحب نے راولپنڈی ایڈیشن کی تیاریوں کا کام اسے سونپ دیا۔

اسے رپورٹنگ سے زیادہ اس طرح کے کاموں پر قدرت حاصل تھی۔ میر صاحب کا غیر معمولی قرب اور اعتماد اسے حاصل ہو چکا تھا۔ راولپنڈی میں جنگ کا پودا لگا دیا گیا۔ نہایت باصلاحیت نیوز ایڈیٹر یوسف صدیقی کو راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ اردو کے اس وقت کے سب سے مقبول مزاح نگار شوکت تھانوی ایڈیٹر مقرر کر دیئے گئے۔ میر صاحب کے بہنوئی اقبال بٹ وہیں موجود تھے جنہیں دن کی شفٹ کا نگران بننا تھا۔ کچھ مقامی بھرتیاں شروع ہوئیں۔ کراچی میں میری اور شورش ملک کی تربیت ہونے لگی۔ شورش کا تعلق چکوال کے گاؤں تھانہ بھون سے تھا۔ انہیں

میری طرح پہاڑوں سے نہیں اپنے آبائی علاقے سے قرب کی تمنا تھی۔ادھر راولپنڈی کے علاقے صدر کی ایڈورڈز روڈ پر لندن بک ڈپو اور کیفے کامران کی بالائی منزل کے فلیٹ حاصل کر کے جنگ کے دفتر قائم ہونے لگے۔ادھر کراچی میں میری زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ مجھے دن کی معمولی شفٹ سے ترقی دے کر رات کی اعلیٰ شفٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہی شفٹ جس میں کام کرنے والے حقیقی صحافی تصور کیے جاتے ہیں۔

اسی کا نام اوقات کا بدلنا ہے۔

---------O---------
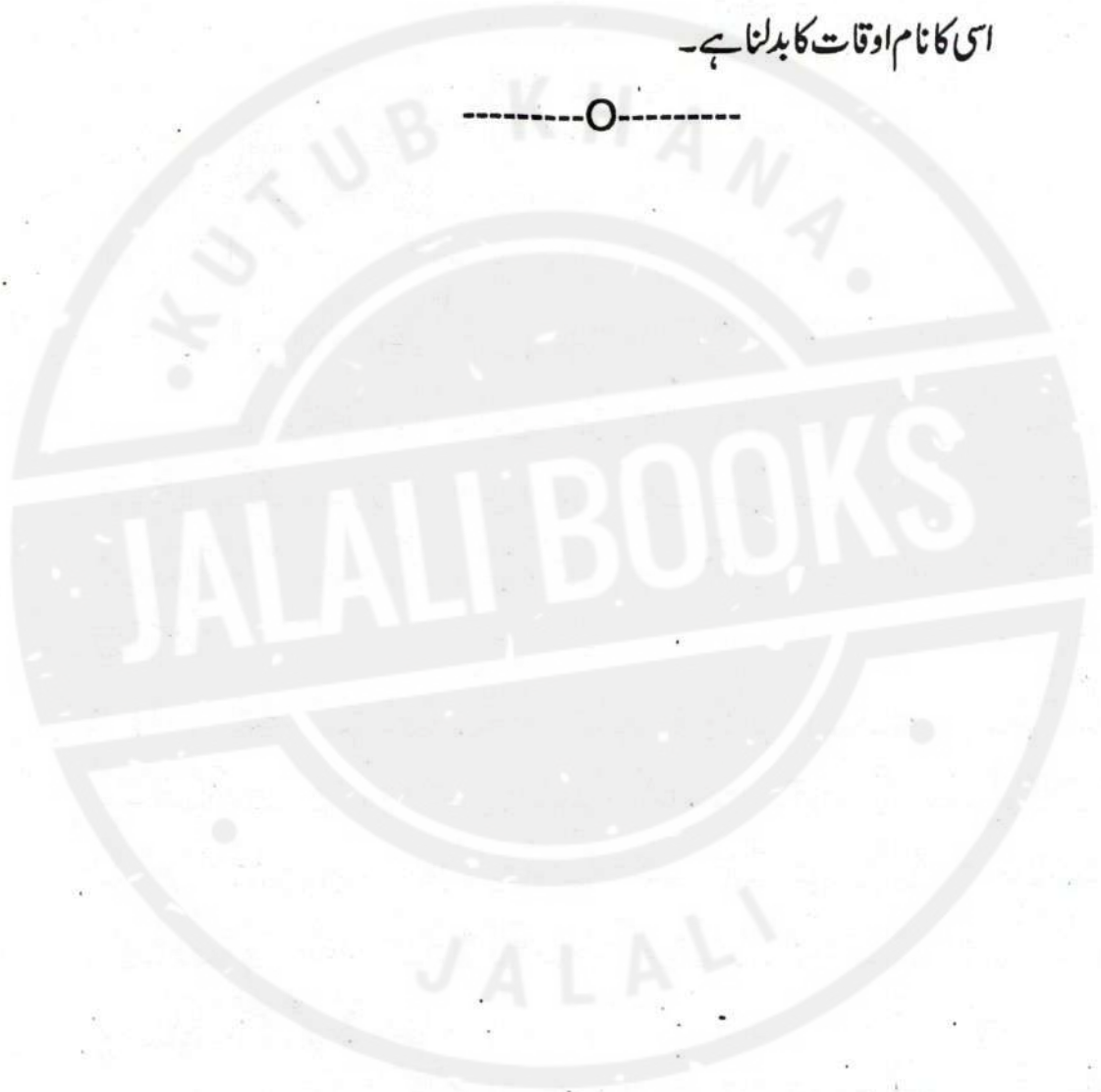
دفتر اور تکیہ

میری زندگی کا ایک طویل رت جگا شروع ہو گیا۔
میں سر شام اپنی بائیسکل پر بیٹھ کر برنس روڈ جاتا اور رات دو بجے تک کام کرتا۔ کام وہی تھا۔ تین چار گھنٹے ترجمہ کرنا اور اتنا ہی وقت لگا کر پروف ریڈنگ کرنا۔ میرے ساتھیوں میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ کچھ دلچسپ، کچھ غیر دلچسپ، کچھ معروف، کچھ گمنام، کچھ کہنہ مشق اور چند نو آموز۔

رات دو بجے کے بعد بائیسکل پر بیٹھ کر واپس ناظم آباد جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ کہیں کتے کاٹنے کو دوڑتے اور کہیں پولیس والے روک کر الٹے سیدھے سوال کرتے۔ اس کا حل میں نے یوں نکالا کہ جب سارے کام مکمل ہو جاتے، اخبار چھپنے کے لیے پریس میں چلا جاتا، نیوز روم کے سارے افراد اور کاتبوں کی فوج اپنے گھروں کو چلی جاتی، میں نیوز روم کی ایک لمبی میز پر سونے کی کوشش شروع کر دیتا۔

میز پر بچھانے کو کچھ نہیں تھا۔ کم سے ایک تکیہ یا تکیے جیسی چیز کی ضرورت تھی۔ دفتر کی ساری کرسیاں لکڑی کی تھیں جن میں تختے ٹھونک دیئے گئے تھے۔ البتہ ایڈیٹر کی کرسی پر ایک کشن پڑا تھا۔ ایڈیٹر تو پھر ایڈیٹر ہوتا ہے۔ اسے ایک گدّے کی رعایت تو حاصل ہونی چاہیے۔ میں نے اسی کشن کو اپنا تکیہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اب جو اسے اٹھایا تو پتا چلا کہ برسہا برس سیّد محمد تقی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے پچک کر چپاتی سا بن گیا تھا۔ چلیے چپاتی میں بھنے ہوئے گیہوں کی خوشبو تو ہوتی ہے۔ اس کشن کو سر کے نیچے رکھنا غضب ہو گیا۔ اس میں روئی کم اور بدبو زیادہ بھری ہوئی تھی۔ اس

قدر تعفن کہ خدا کی پناہ۔ میں نے اسے دور پھینکا اور پرانے اخباروں کا ایک بنڈل بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لکڑی کی میز میرے تن بدن میں چبھنے لگتی۔ یوں محسوس ہوتا کہ پسلیاں چپٹی ہو جائیں گی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوتی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر نیچے اترتا تو پٹھان دربان بھی جاگ چکا ہوتا۔ میں برنس روڈ اور بندر روڈ کے نکڑ پر بہت پرانے ایرانی ہوٹل چلا جاتا۔ ایک ڈبل چائے پیتا اور ساتھ مکھن لگا ہوا بی پی کا بن کھاتا اور اپنی اُسی بائیسکل پر بیٹھ کر صبح کے ٹریفک کا ریلا آنے سے پہلے پہلے واپس گھر پہنچ جاتا۔

گھر کا بستر زندگی میں پہلے کبھی اتنا آرام دہ نہیں لگا۔

اس کے بعد ایک کرب کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ہوتا یہ کہ پھر پلک سے پلک نہ لگتی۔ نیند کوسوں دور چلی جاتی۔ تن بھی جاگتا رہتا اور ذہن بھی۔ لاکھ جتن کرتا مگر کیا مجال کہ ذرا دیر کو بھی آنکھ لگ جائے۔ یہاں تک کہ سہ پہر ہو جاتی۔ میں سائیکل کے پہیوں میں ہوا بھرتا اور کراچی کی سمندری ہوا کا مقابلہ کرتا ہوا دفتر کو روانہ ہو جاتا۔

دفتر کیا تھا ایک عجوبہ تھا۔

یہ کسی صاحبِ حیثیت ہندو سندھی کی چھوڑی ہوئی عمارت تھی جس کی کبھی ایک ہی منزل رہی ہوگی۔ منزل کیا تھی، ایک بڑا سا کشادہ ہال تھا جس کے در و دیوار پر عمدہ ٹائل لگائے گئے تھے جنہیں صاف ستھرا رکھنا آسان تھا۔ ممکن ہے یہ پندرہ بیس بستروں کا اسپتال رہا ہو یا شاید بڑا کاروباری ادارہ ہو۔

اس نیچے والی منزل میں دو طرفہ چھوٹے بڑے کیبن بنا کر اچھا خاصا دفتر بنا لیا گیا تھا جس میں اخبار جنگ کے انتظامی امور نمٹائے جاتے تھے۔ البتہ نیوز روم یا ادارتی شعبہ اوپر کی منزل پر تھا جس کا اولاً وجود ہی نہ ہوگا لیکن اخبار کے دفتر کے قیام کے بعد وہاں بلاک کی دیواریں اٹھا کر دو بڑے کمرے بنا دیئے گئے جن پر سیمنٹ کی چادروں کی چھت ڈالی گئی۔ وہی چادریں جن میں وہ ریشے شامل ہوتے ہیں کہ سانس میں شامل رہیں تو پھیپھڑوں کا سرطان ہو جایا کرتا ہے۔

یہ جو دیکھنے میں عارضی سی تعمیر تھی جس میں ترک وطن کرنے والے سندھی ہندو کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا، اسے کسی اخباری ادارے کی روح بھی سمجھئے اور جان بھی۔ یہاں کے ایک بڑے کمرے میں پچیس تیس خوش نویس بیٹھتے تھے اور دوسرے بڑے کمرے میں ایڈیٹر حضرات تشریف رکھتے تھے۔ کاتبوں کے لیے تخت ڈال دیئے گئے تھے اور وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ جس

پیلے کاغذ پر وہ کتابت کرتے تھے اور جو پہلے سے کھنچی ہوئی سطروں کی مناسبت سے مسطر کہلاتا تھا، اس پر غالباً میدے کا بنا ہوا محلول لیپ دیا جاتا تھا اور پھر بھورے رنگ کی مخصوص سیاہی سے کتابت کی جاتی تھی۔ پیلے رنگ کی حکمت تو یہ تھی کہ کتابت کرنے والے کی آنکھوں پر زور نہیں پڑتا تھا اور میدے کا محلول چھاپے خانے کی جست کی پلیٹ پر کتابت کا عکس اتارنے میں مدد دیتا تھا۔

یہ محلول گرمیوں میں بری طرح عاجز کرتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ سیمنٹ کی چادروں کی چھت سے چھن کر آنے والی دھوپ کی تمازت کی وجہ سے کتابت کیے ہوئے کاغذ خود بخود لپٹ کر گول ہو جاتے تھے۔ چنانچہ انہیں کھول کھول کر پروف ریڈنگ کرنا ہوتی تھی اور اخبار کا صفحہ بناتے وقت دوبارہ کھول کر دیکھا جاتا تھا کہ ان کے اندر کیا ہے۔ یہ اتنا پیچیدہ اور دشوار کام تھا کہ اس کا سمجھانا بھی دشوار ہوا جا رہا ہے۔

اس نیوز روم کا نقشہ کچھ یوں تھا۔ ایک سرے پر ایڈیٹر کی میز کرسی تھی جس پر سیّد محمد تقی بیٹھا کرتے تھے۔ ہے تو عجیب سی بات لیکن اُس وقت کے اخبار میں ایڈیٹر سے مراد وہ شخص ہوتا تھا جو اداریہ یا ایڈیٹوریل لکھتا تھا۔ تقی صاحب بہت خوش خط نہ تھے اور اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بہت تیزی سے لکھتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ فلسفی تھے اور فلسفی کے ذہن میں دلائل اور تاویلات کی یلغار ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنی فکر کو دیکھتے دیکھتے لفظ کی شکل میں ڈھال دیا کرتے تھے۔ ایک بار دنیا کے عظیم فلاسفر برٹرینڈ رسل سے ملے تھے۔ اپنی اس تاریخی ملاقات کی روداد سناتے ہوں گے جس کی شورش ملک دلچسپ نقل اتارا کرتے تھے۔

بے حد دلچسپ آدمی تھے۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ چونکہ اداریہ لکھنے کے بعد اُن کے پاس کوئی دوسری مصروفیت نہیں ہوتی تھی اس لیے نیوز ایڈیٹر ترجمے کے لیے کچھ خبریں انہیں دے دیا کرتا تھا جو وہ بڑی سعادت مندی سے کر دیتے تھے۔

اس دوران شوکت تھانوی بھی بطور ایڈیٹر مقرر ہو چکے تھے۔ انہیں راولپنڈی جانا تھا لیکن اس میں ابھی کچھ دیر تھی۔ خدا جانے کیسے کچھ ایسا نظام وضع کیا گیا کہ ایڈیٹر کی کرسی پر کسی روز تقی صاحب اور کسی شام شوکت تھانوی بیٹھا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی لکھنوی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ وضع قطع، اٹھنا بیٹھنا، بول چال یہاں تک کہ منہ سے آنے والی پان کی خوشبو یوں لگتی تھی کہ سیدھی نخاس سے چل کر کراچی کی برنس روڈ پہنچی ہے۔ جیسی ظرافت ان کی تحریر میں تھی ویسی ہی گفتگو میں تھی۔ میں ان سے یوں بھی متاثر تھا کہ نوعمری میں ان کی تحریر خوب

خوب پڑھ چکا تھا۔ ایک رات پہلی بار ان کا لکھا ہوا اداریہ پروف ریڈنگ کے لیے میرے پاس آیا تو اسی کے ساتھ ان کی اصل تحریر بھی تھی۔ تحریر کیا تھی، پنسل کی نہایت باریک نوک سے کاغذ پر موتی پروئے ہوئے تھے۔ پروف پڑھنے کے بعد اصل تحریر نیچے ٹوکری میں پھینک دی جاتی تھی مگر میں نے شوکت تھانوی کی تحریر احتیاط سے الگ رکھ لی۔ نیوز روم کے میرے ساتھیوں نے بعد میں میرا مذاق اڑایا جس میں میرا کم اور شوکت تھانوی کا حصہ زیادہ تھا۔

اپنے سے برتر لوگوں کو حقیر سمجھنا ہماری طینت کا حصہ ہے۔ میں نے بوکھلا کر وہ تحریر جلدی سے ردی کی ٹوکری کی طرف اچھال دی۔ سب نے مطمئن ہو کر اور سر جھکا کر اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ بالکل یوں لگا جیسے سب کو قرار آ گیا۔

نیوز روم کے سربراہ یوسف صدیقی، جنہیں سرخیاں لگانے میں مہارت حاصل تھی اور جنہیں لوگ سرخی ماسٹر کہتے تھے، دو ایک بار نظر آئے اور پھر کسی روز راولپنڈی چلے گئے۔ اس ہراوّل دستے میں کچھ روز بعد شوکت تھانوی اور شورش ملک بھی جانب پنڈی سدھارے۔

اطہر علی جو اسٹاف رپورٹر کہلاتے تھے، کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ ان کا نیوز روم میں الگ ڈیسک تھا۔ کراچی کی ڈیٹ لائن سے آنے والی ساری خبریں ان کی ٹرے میں جمع ہوتی رہتی تھیں۔ وہ شام کو آتے اور دن بھر حاصل کی ہوئی خبریں لکھ کر نیوز ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے۔

اطہر علی نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ صحافی تھے۔ ان کا تعلق دہلی سے تھا اور انہوں نے تاریخی درسگاہ ''دہلی کالج'' میں تعلیم پائی تھی۔ میں نے بعد میں بی اے کا امتحان دینے کے لیے معاشیات کی جو کتاب پڑھی وہ انگریزی سے اطہر علی ہی نے ترجمہ کی تھی۔ میرے نیوز روم میں شامل ہونے کے کچھ روز بعد ہی وہ بی بی سی میں ملازم ہو کر لندن چلے گئے۔ پورے تیرہ سال بعد اطہر صاحب کے نقش قدم پر چلتا ہوا اور ان ہی کے تعاون سے میں بھی بی بی سی لندن سے وابستہ ہوا۔

انعام عزیز نے یوسف صدیقی کی جگہ سنبھالی۔ وہ کہنہ مشق صحافی تھے اور اپنے زمانے کے حالات کو قریب سے دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بعد میں اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب ''اسٹاپ پریس'' لکھی۔

دوستوں کے دوست تھے مگر دفتر میں انداز افسرانہ تھا۔ ضمیر الدین احمد کی طرح درشت

نہیں تھے لیکن یوسف صدیقی کی طرح گھل مل کر کام کرنے والے بھی نہیں تھے۔ بعد میں وہ بھی بی بی سی لندن چلے گئے۔ وہاں کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد اپنا اردو روزنامہ نکالا جو جنگ کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ آخر میں خانہ نشینی اختیار کی اور پھر چل بسے۔

نیوز روم کے سینئر ساتھیوں میں ایک بڑا نام وحید خاں صاحب کا تھا۔ غیر معمولی تجربہ تھا۔ زبان پر ایسا عبور تھا کہ سبحان اللہ۔ تیز لکھتے تھے مگر خوش خط، ان ہی سے میں نے لفظ ''عِفریت'' پہلی بار سیکھا۔ پروف ریڈنگ کرتے ہوئے میں سمجھا کہ کچھ غلط لکھ گئے ہیں۔ پتا چلا کہ بھوت، دیو اور بھاری بھرکم چیز کو کہتے ہیں۔ وحید خاں بھاری بھرکم تھے لیکن عفریت نہ تھے۔ بہت شفیق تھے۔ صحافی برادری میں ان کا احترام تھا لیکن ان کی لاپروائی کی اتنی شہرت تھی کہ ایک بار ان کی تنخواہ ان کی اہلیہ کے ہاتھ میں دینے کی تجویز ہوئی۔

آٹھویں دسویں روز رئیس امروہوی جنگ کے دفتر آتے تھے اور وہ بھی خوشگوار جھونکے کی طرح۔ بڑے بھائی سیّد محمد تقی کی طرح ہر ایک سے جھک کر ملتے اور مزے مزے کی باتیں کرتے۔ اخبار میں ہر روز ایک قطعہ لکھتے تھے۔ ان کے بعد ویسی شہرت کسی کے قطعات کو حاصل نہیں ہوئی۔ اتوار کے ایڈیشن میں قطعے کے بجائے طویل نظم لکھتے تھے جس میں علمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔

ایک روز دفتر میں قطعہ لکھنے بیٹھے۔ اُن دنوں کچھ اخباری کاغذ کا بحران زوروں پر تھا۔ زور سے بولے کہ بھائیو، کاغذ کا قافیہ بتاؤ۔ سب چپ رہے۔ میرا جی چاہا کہ اتنی ہی زور سے کہوں ''ماخذ'' لیکن چپ رہا۔ ایک تو بڑوں کی بے ادبی کا خیال دوسرے یہ ڈر کہ غلط ہوا تو بڑی شرمندگی ہوگی۔ تیسرے اپنے ان ساتھیوں کے ردِعمل کا خوف جنھوں نے شوکت تھانوی کے ہاتھ کی تحریر محفوظ کرنے پر میرا مذاق اڑایا تھا۔

ایک صاحب اور بھی تھے۔ مجھے بھاتے نہیں تھے، اس لیے ان کا نام بھی یاد نہیں۔ بلا کا تیز ترجمہ کرتے تھے اور رات بھر میں اخبار کے کالم کے کالم بھر جاتے تھے۔ شاید یہ ہے وہ جگہ۔ میں اپنا ترجمہ اپنے تجربہ کار ساتھیوں کو دکھاتا تھا۔ ایک روز میں نے برطانیہ کے مشہور اخبار Guardian کو اردو میں گارڈین لکھا۔ ان صاحب نے انعام عزیز کو کچھ اس طرح بتایا جیسے میری نالائقی پکڑی گئی ہو۔ انعام عزیز نے زیرِلب کہا کہ یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں آج تک حیران ہوں کہ اردو والے گارڈین کو گارجین کیوں لکھتے ہیں۔

انعام عزیز نے ایک بار برطانیہ کی مشہور کال گرل کرسٹین کیلر کو ''کرسٹائین'' لکھ دیا۔ جنگ کا لکھا تو پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے اخباروں کو بھی ''کرسٹائین'' لکھنا پڑا۔ بعد میں انعام عزیز برطانیہ چلے گئے تب انہیں احساس ہوا ہوگا کہ ایک طوائف کے نام کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا۔

برطانیہ آ کر میں نے ایک بار ہیرلڈ ولسن کو ہیرالڈ لکھ دیا تھا۔ ضمیر الدین احمد کی ایسی ڈانٹ پڑی کہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہی بنی۔

نیوز روم میں آ کر مجھے دو ایسے دوست ملے جو پھر زندگی بھر دوست بن کر رہے۔

ہوا یوں کہ دوسرے شہروں سے نامہ نگار ٹیلی فون کر کے جو خبر لکھواتے، اسے لکھنے کا فرض مجھے سونپا گیا۔ میری پیشہ ورانہ زندگی میں کھلنے والی یہ نہایت خوشگوار کھڑکی تھی۔ اخبار کے دو رپورٹر بہت سرگرم تھے اور تقریباً ہر شام وہ فون پر دو ایک خبریں ضرور لکھواتے تھے۔ ان میں ایک راولپنڈی کے حبیب الرحمان اور دوسرے پشاور کے ایس ایم رضوی تھے۔

اِن دونوں کا ذکر راولپنڈی کے باب میں آئے گا کہ اب راولپنڈی کا باب کھلتا ہے۔

---------O---------

جنگ کی جنگ

کراچی سے راولپنڈی جانے والی تیز گام کا ایک پورا ڈبا محفوظ کرایا گیا کیونکہ کراچی سے تقریباً دو درجن خوش نویس لے جائے جا رہے تھے۔ یوں تو راولپنڈی میں کاتبوں کی کمی نہ تھی مگر ان کا خط پنجابی تھا جب کہ جنگ اپنے دلّی کے خط کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ راولپنڈی سے پہلے ہی تین روزنامے نکل رہے تھے۔ نوائے وقت، تعمیر اور کوہستان۔ چنانچہ جنگ کا الگ سے نظر آنا ضروری تھا۔ پھر ہوا یہ کہ کراچی کے کاتبوں کی ٹولی تیز گام کے ڈبے میں سما گئی۔ ان میں ہیڈ کاتب الیاس اور ان کے نائب رضا بھی شامل تھے۔ ڈبے میں ایڈیٹر نام کی مخلوق کا واحد فرد میں تھا۔ کچھ بھی ہو کاتبوں نے میرا بہت خیال رکھا اور ایک بالائی برتھ پر میرا بستر لگا دیا۔

سفر کی یہ رات اُن مسافروں سے لڑتے جھگڑتے گزری جو راہ کے ہر اسٹیشن پر ہمارے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں سمجھایا جاتا تھا کہ یہ ڈبا ریزرو ہے۔ یہ لفظ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُن دنوں اردو میں انگریزی لفظ ٹھونسنے کا چلن عام نہیں تھا۔

رات جیسے تیسے گزری۔ صبح ہوئی تو ہماری گاڑی ریگستان کو پیچھے چھوڑ کر سرسبز پنجاب میں داخل ہو رہی تھی اور چند گھنٹے بعد لاہور آنے والا تھا۔

لاہور آتے ہی کاتبوں کے ناشتے دان کھل گئے۔ ڈبے میں موجود واحد ایڈیٹر صاحب عرش سے اترے۔ جیسے بھانت بھانت کے کھانے اُس روز ملے، پھر شاید ہی کبھی ملے ہوں۔

لاہور میں پڑاؤ لمبا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک باربر صاحب تشریف لے آئے۔ انہیں نائی کہا جاتا تو خفا ہوتے۔ ان کے آتے ہی شیو کرانے والوں کی قطار لگ گئی۔ استرا تیز ہوتا رہا،

داڑھیاں مونڈی جاتی رہیں اور مجھے وہ حکایت یاد آئی جس میں گھوڑوں کے سُموں میں نال گاڑی جارہی تھی اور جسے دیکھ کر ایک مینڈک نے بھی اپنی ٹانگ آگے بڑھادی تھی۔

میری شامت اعمال کہ میں نے بھی اپنے رخسار لاہور کے عوامی نائی کے حوالے کر دیے اور پھر جو میری جلد پر خشکی جیسی وباء نازل ہوئی وہ کئی سال تک میری جان سے چمٹی رہی۔

دن ڈھل چکا تھا جب ہماری گاڑی راولپنڈی کے پلیٹ فارم پر لگی۔ ہمارے خیر مقدم کے لیے اخبار کے اکثر سینئر حضرات اسٹیشن پر موجود تھے۔ان میں سب سے آگے پنڈی ایڈیشن کے ایڈیٹر شوکت تھانوی اپنے مخصوص تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھے، ان کے علاوہ سرکار حسن صاحب اپنی شیروانی اور علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی میر ناصر محمود بھی تھے جو میر خلیل الرحمان کے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور جنہیں جنگ راولپنڈی کا انتظامی نگران بنا کر بھیجا گیا تھا۔

9 نومبر کی سرد شام تھی اور کراچی والے گرم کپڑے پہن کر نہیں آئے تھے۔ کاتبوں کے لیے شہر میں کوئی عمارت لی گئی تھی۔ اُن سب کو تانگوں میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ تانگے دوڑے ہوں گے تو اچھی بھلی سردی لگی ہوگی۔

مجھے اپنی بڑی بھاوج کے گھر جانا تھا۔ ان کا مکان جسے اعراف کا نام دیا گیا تھا، مری روڈ پر لیاقت باغ کے عین مقابل تھا۔ میں وہاں پہلے بھی دو مرتبہ جا چکا تھا اور ہر بار میری پذیرائی ہوئی تھی۔ اس لیے اس بار بھی بے تکلف جا پہنچا اور مجھے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا گیا۔

میں اپنی زندگی کے نئے سویرے کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

بنارس کی صبح کی بہت دھوم ہے لیکن جیسی صبح راولپنڈی کے جاڑوں کی ہوتی ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ سویرے سویرے جب ہزاروں افراد سائیکل پر بیٹھ کر، دستانے پہن کر، مفلر لپیٹ کر اور موٹے موٹے کوٹ پہن کر منہ سے بھاپ اڑاتے شہر سے کنٹونمنٹ کی طرف کام پر جاتے ہیں تو صبح کی ہلکی ہلکی دھند اُس منظر میں عجیب سا رنگ بھر دیتی ہے۔ سائیکلوں کے درمیان تانگے دوڑ لگاتے جاتے ہیں اور تانگے والوں کی صدائیں پورے منظر میں آوازوں کو گھول دیتی ہیں، اس وقت صبح صبح جھاڑو دینے والے خاکروبوں کے ہاتھوں اڑتی خاک بھی بدنما نہیں لگتی اور اس وقت سورج کی شعاعیں درختوں سے چھن کر اس خاک اور دھند میں لکیریں کھینچتی ہیں تو نالہ لئی کا گدلا پانی بھی روپہلا ہو جاتا ہے۔

پچھلی شام تیز گام سے راولپنڈی پہنچنے والے سارے مسافر صدر کی ایڈورڈز روڈ پر جنگ کے دفتر پہنچنے شروع ہوئے۔ ایک بار پھر ملاقاتیں ہوئیں۔ سب نے نئی عمارت اور نئے ساتھیوں کو غور سے دیکھا۔

ایک بڑے کمرے کے درمیان بڑی سی میز ڈال کر اسے نیوز روم بنا دیا گیا تھا۔ خبر نویس عملے کے تمام افراد کو اسی میز کے گرد بیٹھنا تھا اور اسی ٹھنڈے کمرے میں ٹھٹھرنا تھا۔ اس کے برابر ایک حصہ یوسف صدیقی کے لیے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس حصے کے اندر ایک بہت چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں خبر رساں اداروں اے پی پی اور پی پی آئی کے شور مچاتے ٹیلی پرنٹر رکھے تھے البتہ وہیں خود اخبار کا اپنا وہ ٹیلی پرنٹر بھی رکھا گیا تھا جس کے تار جا کر کراچی کے دفتر سے ملتے تھے اور جس پر بڑی اور اہم خبروں کا تبادلہ ہوتا تھا۔

باہر دالان میں ایک کمرہ ایڈیٹر یعنی شوکت تھانوی کا تھا، دوسرا کمرہ اکاؤنٹینٹ اور کیشیئر کا اور تیسرا کمرہ پنڈی ایڈیشن کے انچارج میر ناصر محمود کا تھا۔ یہ سب ایک فلیٹ میں تھا جسے درمیان کا دروازہ کھول کر برابر والے فلیٹ سے ملا دیا گیا تھا جس میں کاتبوں کے بیٹھنے (اور ٹھٹھرنے) کے لیے بڑا سا کمرہ تھا۔ ایک چھوٹے کمرے میں اخبار کے صفحات بنتے تھے یا دفتری اصطلاح میں جہاں کاپی جوڑی جاتی تھی اور تیسرا کمرہ فوٹو گرافروں کے لیے تھا۔

کام شروع ہوا۔ دن کا ڈھلنا تھا کہ پنڈی کے جاڑے دستک دیئے بغیر اندر چلے آئے۔ خدا کا شکر ہے کسی نے کوئلے کی بڑی بڑی انگیٹھیوں کا بندوبست کر رکھا تھا ورنہ ایڈیٹروں اور کاتبوں کی انگلیوں کو قلم پکڑنے کا ارمان ہی رہ جاتا۔

آپ حیران ہوں گے کہ اخبار کے مالک میر خلیل الرحمان کے کمرے کا ذکر تک نہیں آیا۔ تو یہ ان کی شان تھی کہ جب کوئی نیا کام شروع کرتے تھے تو کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ بالکل یوں جیسے بچے کی ولادت کے وقت دکھ سہیں اس کی اماں اور ابا جان کسی پچھلے دروازے سے نکل جائیں۔

خبر یہ ملی کہ میر صاحب کو کوئی نیا کام شروع کرتے ہوئے ناکامی کا خوف ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ اگر اخبار کی پانچ ہزار کاپیاں فروخت ہو جائیں تو مجھے بلا لینا۔

پہلے روز نو ہزار پرچے فروخت ہوئے۔ دوسرے روز گیارہ اور تیسرے دن تیرہ ہزار پرچے فروخت ہوئے۔ راولپنڈی کی خاک کو میر خلیل الرحمان کا ہاتھ لگ چکا تھا۔ اخبار کی فروخت

میں روزانہ کے اضافے کی تصدیق یوں ہوئی کہ یوسف صدیقی نے مجھے اور شورش ملک کو نوید سنائی، ہماری ماہانہ تنخواہ ڈیڑھ سو سے بڑھا کر دو سو کر دی گئی۔

اس کے آگے کی کہانی کی بنیاد یوں تو روزانہ پیش آنے والے واقعات پر رکھی جا سکتی ہے لیکن میں ایک دوسرا اور مختلف راستہ اختیار کر رہا ہوں۔ اخبار کا کام اور دفتر کا نظام کیسے چلا، میں یہ بتانے کی بجائے یہ بتانے جا رہا ہوں کہ اخبار اور دفتر کا کام اور نظام کس کس نے چلایا۔ میں کہانی کی بنیاد واقعات کو نہیں، افراد کو بنا رہا ہوں۔ کس نے کون کون سا مورچہ سنبھالا اور جنگ کی جنگ کیسے لڑی، سچ پوچھیے تو یہ میرے ہم پیشہ ساتھیوں اور رفقائے کار کو میرا اخراجِ عقیدت ہے۔ عقیدت یوں کہ ان میں چند ایک کے سوا سارے کے سارے پیوندِ خاک ہو چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ساری صورتیں تصور میں نہ صرف زندہ بلکہ تابندہ بھی ہیں۔

شوکت تھانوی: مزاح لکھتے لکھتے اور ریڈیو پاکستان سے مشہور پروگرام ''قاضی جی'' پیش کرتے کرتے شوکت تھانوی خدا جانے کیسے ایک بڑے روزنامے کے ایڈیٹر بن گئے۔ یوں جنگ کا ایڈیٹر بننا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سیّد محمد تقی کی طرح شوکت تھانوی صرف اداریہ لکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مزاح نگاری کی اپنی مشق اور شہرت کی بنا پر ایک کالم بھی لکھتے تھے۔ راولپنڈی چونکہ پہاڑ کے دامن میں آباد ہے، اس مناسبت سے انہوں نے اپنے کالم کا عنوان ''پہاڑ تلے'' رکھا تھا۔ اتوار کے اتوار وہ غالباً ایک نظم بھی لکھتے تھے۔

اپنی وضع قطع سے وہ بنے بنائے لکھنؤ کا مرقع تھے۔ ہمیشہ عمدہ لباس اور وہ بھی بہت قرینے سے پہنا کرتے تھے۔ یا تو تھری پیس سوٹ یا عمدہ شیروانی اور تنگ پاجامہ۔ ساتھ میں پانوں کی ڈبیا رہتی تھی اور پان کھاتے تھے تو ان کا کمرہ مہکتا تھا۔ اپنے رفقائے کار کے ساتھ پیار سے پیش آتے تھے جس میں مسلسل لطیفہ گوئی شامل ہوتی تھی۔ ایک بار طے ہوا کہ سارا عملہ میرے اور نیّر علوی کے گھر جمع ہو کر مرغ قورمہ کھائے گا۔ سبھی آئے لیکن ہوٹل سے کھانا آنے میں دیر ہوگئی۔ شوکت تھانوی کو شدید بھوک لگی تو انہوں نے ایک شعر پڑھا جس کا پہلا مصرعہ کچھ یوں تھا ؎

ضُعف سے کاکلِ امید کٹی جاتی ہے

دوسرے مصرعے کے ردیف قافیے کا قیاس آپ خود ہی کر لیجیے۔

کبھی کبھی نوجوان انہیں گھیر لیا کرتے تھے اور طرح طرح کے سوال کیا کرتے تھے۔ ایک بار لڑکوں نے پوچھا کہ اپنی اردو بہتر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ شوکت تھانوی نے مشورہ

دیا کہ میر انیس کے کے مرثیے پڑھا کرو۔

ایک روز لڑکوں نے کہیں یہ پوچھ لیا کہ وہی وہانوی کے نام سے کیا آپ ہی لکھتے تھے؟ بظاہر بہت خفا ہوئے۔

کبھی کسی نے نہیں پوچھا اور نہ خود انہوں نے بتایا کہ ایک زمانے میں لاہور کی فلمی صنعت سے بھی وابستہ تھے اور نور جہاں کی مشہور فلم خاندان کے گانے لکھنے میں بھی اُن کا دخل تھا۔ شعر اچھے بھلے کہتے تھے۔ایک بار خاندانی منصوبہ بندی کا ہفتہ منایا جارہا تھا تو انہوں نے لکھا ۔

اے مرے دلبر، مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو

اور اگر ہونا ہی ہے ہو تو میرے گھر پیدا نہ ہو

ہمیشہ پنسل سے لکھتے تھے۔سامنے گلاس میں بہت سی پنسلیں کھڑی ہوتی تھیں جن کو تراش کر باریک نوک بناتے رہتے تھے۔خط اتنا پختہ اور سطریں اتنی سیدھی اور برابر ہوتی تھیں کہ کیا مجال کہیں فرق آ جائے۔میں نے بارہا ان کی تحریریں پڑھیں۔اپنا لکھا ہوا کبھی کاٹتے نہیں تھے۔

ریڈیو پاکستان سے تعلق ہمیشہ قائم رکھا۔کراچی کے بعد راولپنڈی آ کر بھی ریڈیو کے لیے ڈرامے اور اپنا ہفتہ وار پروگرام ''قاضی جی'' لکھتے رہے جس میں قاضی جی کا کردار خود ادا کرتے تھے۔ مجھے ان کا کراچی کا ڈراما ''غبارہ'' یاد ہے جس میں سحاب قزلباش غبارے میں بیٹھ کر بالائی فضا یا خلاء میں چلی جاتی ہیں اُن کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ پھر وائرلیس پر وہ زمینی رصدگاہ میں موجود اپنے والد یعنی شوکت صاحب سے گھبرا گھبرا کر جو گفتگو کرتی ہیں، اسے سن کر سامعین کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

شوکت تھانوی نے ریڈیو ہی کی ایک فنکارہ سے شادی کر لی تھی۔ اس کے علاوہ نہ انہوں نے کچھ بتایا، نہ ہم نے پوچھا۔

خود جو طویل اداریہ لکھتے تھے اس کے آخر میں ایک چھوٹا اداریہ ہوتا تھا جسے وہ کبھی نوٹ اور کبھی شذرہ کہتے تھے۔شذرہ تسبیح میں پروئے ہوئے چھوٹے سے دانوں کو بھی کہتے ہیں۔ یہ شذرہ ایک روز مَیں لکھتا تھا اور ایک روز شورش ملک لکھا کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد یوسف صدیقی، مَیں اور نیّر علوی کراچی چلے گئے۔شوکت تھانوی چل بسے اور اُس تسبیح کے دانے بکھر گئے۔

یوسف صدیقی: خبر کو پرکھنا اور برتنا۔یہ فن جیسا یوسف صدیقی کو آتا تھا، میں نہیں سمجھتا

کہ کسی اور کو آیا ہوگا۔ اپنے اسی ہنر سے انہوں نے اخبار جنگ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ورنہ روزنامہ انجام میں کون سی کمی تھی۔ یوسف صدیقی، یا یوں کہیے کہ محمد یوسف صدیقی کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا۔ صحافت میں کب اور کیسے آئے، مجھے خبر نہیں اور صحافت سے کب اور کیسے گئے، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

ایک زمانہ تھا جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا تنازعہ جنگ کے میدان میں نہیں بلکہ ریڈیو کے میدان میں چل رہا تھا۔ ایک طرف بھارت کے ریڈیو سے پاکستان پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں، ادھر سے پاکستان کے ریڈیو سے جسے آزاد کشمیر کا ریڈیو کہا جاتا تھا، بھارت کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جاتا تھا۔ اس کبڈی میں سارا کمال فقرے بازی کا ہوا کرتا تھا۔ کسی پروگرام کا نام تھا ''ڈھول کا پول'' اور اس کی ضد میں نشر کیے جانے والے پروگرام کا عنوان تھا ''گنبد کی آواز'' اس میں فریق مخالف کے منہ پر مارے جانے والے فقرے لکھنے والوں میں یوسف صدیقی بھی شامل تھے۔ اکثر ہم لوگوں کو بتایا کرتے تھے کہ سارا کمال مناسب جگہ مناسب لفظ رکھنے کا تھا جسے فارسی زدہ زبان میں لفظوں کی نشست و برخاست کہا جاتا ہے۔

جنگ کراچی میں مقبوضہ کشمیر کی خبروں پر پھڑکتی ہوئی سرخیاں لگا کر یوسف صدیقی نے اخبار کی فروخت دوگنی کر دی اور عجب بات یہ ہے کہ اخبار پھر کبھی پسپا نہیں ہوا۔ اسی کارکردگی کی بنا پر انہیں راولپنڈی بھیجا گیا۔ جنگ کی تاریخ میں کراچی سے باہر اس کا یہ پہلا ایڈیشن نکل رہا تھا۔

یہاں دن کی شفٹ کے نگران میر خلیل الرحمان کے بہنوئی اقبال بٹ تھے۔ رات کی اہم شفٹ کو خود یوسف صدیقی دیکھتے تھے۔ ان کے ماتحت اکثر نوآموز تھے۔ چنانچہ تربیت کا عمل ساتھ ساتھ جاری تھا۔ یوسف صاحب زندہ دل تھے، دوستوں میں بیٹھتے تو ان کے قہقہے اوروں سے بلند ہوتے۔ ایک بار سارا عملہ کھانے پر بیٹھا اور تقریروں کی باری آئی۔ میں نے بولنا شروع کیا تو انہوں نے ٹہوکا دیا ''سیریس (Serious) نہیں، سیریس نہیں۔''

شاموں کو ترنگ میں ہوتے تو مے نوشی کر لیا کرتے تھے اور ہاتھ تنگ ہو تو ہم جونیئر لوگوں سے قرض لے لیا کرتے تھے۔ ان دنوں اخبار میں نجومی کا کالم لکھنے کا کام مجھے سونپا گیا۔ میں موقع سے فائدہ اٹھا کر یوسف صدیقی کے برج میں لکھ دیا کرتا تھا ''لوگوں سے لیے ہوئے قرض واپس کرو۔'' مگر یہ تدبیر کبھی کارگر نہ ہوئی۔ ایک بار ریڈیو کے لیے ایک تقریر مجھ سے لکھوائی جو مولوی تمیزالدین خاں کے انتقال پر تھی۔ اس کا معاوضہ کون جانے کہاں گیا۔

اس مے نوشی کے بعد یوسف صاحب کے اندر ایک عجب تبدیلی آئی۔ خدا جانے کب اور کیسے ان کا جھکاؤ جماعت اسلامی کی طرف ہوگیا اور یہ بھی خبر نہیں کہ وہ جنگ کی ملازمت سے کب اور کیوں تنگ آ گئے۔ سنہ 62ء میں فخر ماتری مرحوم کراچی سے بہت شان و شوکت سے روزنامہ حریت نکالنے والے تھے۔ انہوں نے نا معلوم کیسے یوسف صاحب کو توڑ لیا۔ زیادہ اجرت کی وہی کشش رہی ہوگی جس کے تحت میں اور نیر علوی بھی راولپنڈی چھوڑ کر کراچی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ یوسف صاحب نے کراچی پہنچ کر نئے اخبار کی بنیاد رکھی اور کئی صحافی ملازم رکھے۔ ذوا ایک کے سوا سب کا تعلق ہو یا نہ ہو، جھکاؤ جماعت اسلامی کی طرف تھا۔

حریت دھوم دھام سے نکلا۔ اس اہتمام سے کبھی کوئی اردو اخبار نہیں نکلا ہوگا۔ اس کا احوال آگے آئے گا۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ماتری صاحب کے سارے وسائل نئے اخبار میں کھپ گئے اور مالی مشکلات سر اٹھانے لگیں۔ اس وقت ہم سب دوسرے ٹھکانے ڈھونڈنے لگے۔ اُن ہی دنوں یوسف صدیقی حریت چھوڑ کر خدا جانے کس طرف سدھار گئے۔ پھر ان کی کوئی خبر کم سے کم مجھے تو نہیں ملی۔ سنا ہے انہوں نے پھر اخبار جنگ کی طرف رجوع کیا مگر یہ بھی محض کانوں سنی ہے، آنکھوں دیکھی نہیں۔

اقبال بٹ: جنگ کراچی سے راولپنڈی آئے تھے۔ دن کی شفٹ یعنی اندر کے صفحات کے نگران تھے۔ میر خلیل الرحمان کے بہنوئی تھے۔ کبھی اسکولوں میں پڑھایا کرتے تھے، اس لیے ان کی شخصیت میں ایک ماسٹر چھپا ہوا تھا۔ چھوٹا سا قد، بڑھاپے کی دہلیز اور قدیم طرزِ صحافت کا نمونہ تھے۔ اقبال صاحب کا تعلق وہی وزیر آباد اور گجرات سے تھا جہاں سے میر خلیل الرحمان اور ان کے بزرگ تجارت کرنے کبھی دلّی گئے ہوں گے۔ چنانچہ ان کا شمار پنجابی سوداگرانِ دلّی میں ہوتا رہا۔ ان کے مزاج میں سوداگری تھی یا نہیں اور اگر تھی تو کتنی، میں فیصلہ تو نہیں سنا سکتا مگر اس کے اشارے بار بار نظر آئیں گے۔

جنگ راولپنڈی کے نیوز روم میں ایک بڑی سی میز ڈالی گئی تھی جس کے سرے پر اقبال بٹ بیٹھ کر اور سگریٹ کو انگلیوں میں دبا کر چلم کی طرح پیا کرتے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے اُس میز کے نیچے دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی رکھی جاتی تھی جس سے لوگوں کی ٹانگیں گرم رہتی تھیں۔ باقی دھڑ کو جاڑے سے بچانے کے لیے کوئی گرم کپڑے پہنتا اور کوئی شال، رضائی یا اسی طرح کی چیزیں لپیٹ کر بیٹھتا تھا۔ اس کیفیت میں اقبال بٹ پنجابی شعر فی البدیہہ پڑھا

کرتے تھے جس کے پہلے مصرعے کا مطلب تھا کہ کمبل اوڑھ کے اور انگیٹھی جلا کے۔

خبراں کر رئے تو کالم بھر رئے

اس لفظ ''بھر'' میں پنجابی لہجہ ڈالنے کے لیے آپ چاہیں تو اسے ''پھر'' پڑھ لیں۔ دراصل یہ کالموں کا پیٹ بھرنے کا فلسفہ اس دور کی صحافت کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اخبار جنگ میں جب سے اس کی ولادت ہوئی ہے، پیرا گراف بنانے کا تصور نہیں۔ ایک بار تو یہ تک ہوا کہ ہر خبر کی آخری سطر اگر نسبتاً چھوٹی ہوتی تو یوسف صدیقی اس خالی جگہ میں لکیر کھنچوا دیتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اخباری صفحہ بھرا بھرا نظر آئے تو پڑھنے والے پر رعب پڑتا ہے۔

یہ دراصل حسِ لطیف کی کمی تھی۔ اس کے برعکس روزنامہ مشرق کے بانی اور اردو صحافت کے انقلابی مرد بیمار عنایت اللہ مرحوم اخباری صفحے کو طرح طرح سے سجانے اور نکھارنے کے قائل تھے۔ ان کے صفحات پر سفیدی بکھری ہوتی تھی اور کالم بھرنے کے برعکس وہ کہا کرتے تھے کہ عبارت کی دیوار نہ کھڑی کرو، اس میں کھڑکیاں کھولا کرو۔

اقبال بٹ اور شورش ملک بہت اچھے دوست تھے۔ دونوں پنجابی میں شاعری کیا کرتے تھے۔ شورش کا ذکر ذرا دیر بعد آئے گا۔

میر ناصر محمود: میر خلیل الرحمان، میر حبیب الرحمان اور میر جمیل الرحمان کے بھائی تھے اور وہ جو کنبے میں ایک آدھ لڑکا ذرا پیچھے رہ جاتا ہے، وہ تھے۔ باقی بھائیوں کے نام کے وزن پر ان کا نام میر جلیس الرحمان تھا لیکن مجھے خبر نہیں کہ یہ خاندانی نام کیوں چھپایا گیا۔ غالباً خاندان میں کچھ فرق تھا۔ ناصر محمود کو اخبار کے راولپنڈی ایڈیشن کا نگران بنا کر بھیجا گیا تھا۔ نوجوان تھے اور ہم عمر دوستوں کے حلقے میں گھرے رہتے تھے۔ اخبار کے انتظامی معاملات میں مشکل ہی سے کوئی دخل تھا لیکن دوستوں کے مجمع میں کھانے پینے کا بڑا اہتمام ہوا۔ یہاں یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کراچی کی برنس روڈ کی آلودہ فضا کے بعد راولپنڈی کے پہاڑوں سے اتر کر آنے والی تازہ اور شفاف ہوا کا اثر یہ ہوا کہ کراچی سے جانے والے پورے قافلے کا رنگ روپ بدلنے لگا۔ رخسار سرخ ہونے لگے۔ چہرہ بھرنے لگا اور صحت مند ساتھیوں کو دیکھ کر خوشی ہونے لگی لیکن سب سے زیادہ روپ میر ناصر محمود کے تن بدن پر آیا۔ مجھے ان کی سفید ہتھیلیاں یاد آتی ہیں جو بالکل سرخ ہوگئی تھی۔

پھر وقت نہ صرف گزرا بلکہ بدلا اور بہت عرصے بعد میں نے ناصر محمود کو جنگ کے لندن

کے دفتر میں دیکھا۔شاید وہ اخبار کا چھاپہ خانہ چلا رہے تھے اور اس روز انہوں نے پرنٹنگ پریس کے کارکنوں کی سیاہی آلودہ وردی پہن رکھی تھی۔ کچھ عرصے بعد مر گئے۔

شورش ملک: میرے ہم عمر تھے لیکن قد اور تن بدن کے معاملے میں مجھ سے دو گنے تھے۔شورش بھی میری طرح کراچی سے پنڈی گئے تھے لیکن ان کا آبائی ٹھکانہ راولپنڈی کے قریب چکوال کا گاؤں تھانہ بھون تھا۔شورش میں حسِ مزاح غضب کی تھی۔لطیف ساتھیوں کو جی کھول کر سراہتے تھے اور ان کے پاس آنے والے دوست احباب بھی ان ہی جیسے تھے۔ان کے دوستوں میں فتح محمد ملک سرفہرست تھے جو اب اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔شورش شعر پسند تھے اور خود بھی پنجابی میں شعر کہتے تھے۔راولپنڈی میں آباد ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد گاؤں جا کر شادی کر لی۔

ایک ہفتے بعد واپس آئے تو احباب نے (پنجابی میں) پوچھا "بچے ساتھ لائے ہو؟" یہ سُن کر (اردو والے) دنگ رہ گئے مگر کتنے ہی معاشروں میں گھر کی عورتوں کو گھر کی عورتیں کہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ہم ہوتے تو شورش کی دلہن کو بھابھی کہتے۔اہلِ دکن ہوتے تو حرم کہتے۔ایسے ہوتا آیا ہے۔

شورش بہت زندہ دل تھے۔ان کے ایک دوست ان سے مخاطب ہو کر ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔

شورش میرا دعویٰ ہے کہ بہ ایں ہمہ دانش
تم میری محبت کو سمجھ ہی نہیں سکتے

یوں یہ شعر شاید شورش کاشمیری کا تھا۔

شورش ملک آخر عمر تک جنگ کے محاذ پر ڈٹے رہے اور راولپنڈی ایڈیشن کے ایڈیٹر ہو گئے مگر زیادہ عرصے نہیں جیے۔

نیّر علوی: جنگ کے عملے میں جو لوگ راولپنڈی سے بھرتی کیے گئے ان میں نیّر علوی بھی تھے۔نوجوان، ذہین اور اپنے کام میں ماہر۔یوسف صاحب نے مجھے بتایا کہ آزمائش کے لیے نیّر کو ترجمے کے لیے کوئی چیز دی گئی۔انہوں نے چند منٹ میں ترجمہ کر کے یوسف صدیقی کے ہاتھ میں تھما دی۔نیّر علوی راولپنڈی کے کہنہ مشق صحافی بشیر الاسلام عثمانی کے سالے تھے جو روزنامہ تعمیر سے منسلک تھے۔ممکن ہے نیّر نے ان کے اخبار میں کام کیا ہو۔

وہ رات کی شفٹ میں کام کرتے تھے اور دن میں کم ہی نظر آتے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ رات کو جاگنے کے بعد دن بھر سو کر نیند پوری کر لیتے تھے۔ یہ نعمت کم ہی لوگوں کو حاصل تھی۔

ایک مرحلے پر یہ ہوا کہ مجھے اور نیّر کو رہنے کے ٹھکانے کی تلاش تھی۔ ہمیں راولپنڈی کے محلہ گوالمنڈی میں ایک مکان مل گیا۔ یہ گوالوں کی بستی تھی جہاں ہر شام دودھ دوہا جاتا تھا تو اس کی دھار کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اس مکان میں دو کمرے تھے۔ تیسرے اور چھوٹے کمرے میں ہمارا ملازم صابر رہتا تھا جو ناشتہ اور کھانا تیار کیا کرتا تھا۔ مکان کی چھت اگرچہ ٹین کی تھی لیکن اس کے اوپر مٹی کی تہہ جما دی گئی تھی تاکہ دھوپ کی حدت نیچے کمروں میں نہ آئے۔

ان دونوں کمروں کے آگے برآمدہ بھی تھا۔ ہمارے مہمان اسی میں سلائے جاتے تھے۔ مجھے اپنے مہمان یاد رہیں گے۔ ایک تو ہمارے پشاور کے نامہ نگار ایس ایم رضوی اور دوسرے میرے نوجوانی کے دوست غازی صلاح الدین تھے۔ ان کے علاوہ میرے اور نیّر کے دوسرے دوست باقاعدگی سے آتے رہتے تھے۔ وہیں ایک بار جنگ کے سارے عملے کی دعوت ہوئی تھی جس میں شوکت تھانوی مرحوم خوب خوب چہکے تھے۔ نیّر کا ایک دوست دوا فروش تھا۔ ہم لوگوں کے دوا علاج میں وہی ہاتھ بٹاتا تھا۔ کبھی کبھی خوب رونق رہتی تھی۔ قریب ہی روزنامہ جنگ کا چھاپہ خانہ تھا جس کے بعض ملازم ہماری نوجوان جمعدارنی کا پیچھا کرتے کرتے آ جاتے تھے اور اس وقت جاتے تھے جب جمعدارانی اپنی بڑی سی جھاڑو دکھا کر کہتی تھی کہ تجھے مور بنا دوں گی۔

دو نوجوان اور بن بیاہے صحافیوں نے راولپنڈی کے جس علاقے کو آباد کیا اس کا احوال کہے بغیر دل نہیں مانتا۔

یوں تو وہ بڑا علاقہ گوالمنڈی کہلاتا تھا لیکن جن گوالوں اور گھوسیوں کی وجہ سے یہ محلّہ گوالمنڈی کہلاتا تھا، ان کے گھروں کی دیواریں ہمارے گھر سے ملتی تھیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ان کی بہو بیٹیاں خاصی بے باک تھیں اور ہمارے گھر کی پوری خبر رکھتی تھیں۔ وہ مختلف بہانوں سے اندر آنا چاہتی تھیں اور ان میں وہ لڑکیاں پیش پیش تھیں جو ابھی سیانی ہوئی تھیں۔

میں نے اور نیّر نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو جائے ان خواتین کو نہ تو منہ لگایا جائے گا اور نہ گوالوں کی جوان جہاں بیٹیوں کو گھاس ڈالی جائے گی۔ چھاپے خانے کے لڑکے ہماری گلی کے چکر کاٹنے لگے تو ہم نے انہیں سختی سے منع کیا۔ ہم نے طے کر لیا کہ ہمارے گھر میں دفعہ 302 ت پ کے تحت پرچہ چاک نہیں ہوگا اور اس میں ہمیں کامیابی ہوئی۔

یہ تو ہمارے گھر کی دائیں جانب کا احوال تھا۔ بائیں جانب دوسرا ہی منظر تھا۔ یہ پرانے زمانے کا اور غالباً سکھوں کے دور کا بڑا سا احاطہ تھا جس کی چاروں طرف چھوٹے اور تنگ مکان تھے جو سارے کے سارے احاطے کی طرف کھلتے تھے۔ ان مکانوں میں زیادہ تر پختہ عمر کی عورتیں اور دن بھر سخت مزدوری کرنے والے ان کے شوہر رہتے تھے۔ ان لوگوں کی ذات پات کا بیان مشکل ہے کیونکہ مسلمانوں میں سنا ہے سب برابر ہوتے ہیں۔

ہمارا ان لوگوں سے اور ان لوگوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہم تو کبھی آنکھ بھر کر بھی اُس طرف نہیں دیکھتے تھے لیکن کیا کریں اپنے کانوں کا جن میں ان لوگوں کی بولی ٹھولی نہ چاہتے ہوئے بھی پڑتی رہتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا ایک لفظ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ایک بار یہ ہوا کہ اس احاطے میں گویا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ احاطے کی ایک جانب آباد عورتوں اور بالکل سامنے والے مکانوں میں رہنے والی عورتوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اب جو دونوں جانب سے تو تکار شروع ہوئی تو توبہ ہی بھلی۔ یہ لڑائی صبح شروع ہوئی اور دن بھر جاری رہی۔ شام کو گھر کے مرد کام سے لوٹ کر آتے تو ان کا ایک آدھ فقرہ سنائی دیتا تھا۔ باقی ساری گولہ باری دونوں طرف کی عورتیں کر رہی تھیں۔

اگلا منظر ہم نے بھی دیکھا۔ دونوں طرف کی عورتوں کے سامنے ایک ایک ٹوکرہ رکھا تھا۔ جب تک زبانی جنگ جاری رہی ٹوکرہ سیدھا رکھا رہا۔ شام مغرب کے وقت دونوں طرف کی عورتوں نے اپنا اپنا ٹوکرہ الٹ کر رکھ دیا اور اخبار کی زبان میں عارضی جنگ بندی ہوگئی۔

اگلی صبح انہوں نے اپنا اپنا ٹوکرہ سیدھا کیا اور بات جہاں ختم ہوئی تھی وہیں سے اُسی لَے اور اسی تان میں دوبارہ شروع ہوگئی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ دونوں طرف کی عورتیں بولے جا رہی تھیں۔ دوسرے کی بات نہیں سنتی تھیں۔ شام کو پھر ٹوکرے الٹ دیئے گئے اور یہ سلسلہ تین دن جاری رہا۔ چوتھے دن خدا جانے کیا ہوا، سناٹا چھا گیا اور ہمارے پڑوس کے مکان میں جو لوگ رہتے تھے، ان کے ریڈیو پر ایک بار پھر سنائی دیا:

برکھا بہار آئی......رس کی پھوہار لائی

انکھیوں میں پیار لائی......او سجنا۔

اُن دنوں کمپنی باغ میں سیب اور آلوچے کے درختوں پر پھول لدے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش مسلسل ہوئے جا رہی تھی۔

سنہ 62ء میں جب فخر ماتری مرحوم کراچی سے روزنامہ حرّیت نکالنے کی تیاری کر رہے تھے، وہ راولپنڈی آئے۔ یوسف صدیقی سے ان کا معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ یوسف صاحب نے اپنے دو شاگردوں یعنی مجھے اور نیّر کو ان سے ملوایا اور ہمارا کراچی منتقل ہونا طے پایا۔ نیّر علوی کا باقی ذکر کراچی کے باب میں ہوگا۔

حبیب الرحمان (2): اب میرا کام ذرا دشوار ہو گیا ہے کیونکہ جنگ پنڈی کے دو بڑے اہم کرداروں کا تذکرہ ہے اور دونوں کا کام حبیب الرحمان تھا۔ شہر والوں نے تو اپنا کام آسان کر لیا تھا۔ وہ ایک کو حبیب چپٹا اور دوسرے کو حبیب جنگی کہتے تھے لیکن میرے نزدیک یہ سراسر بدتمیزی ہے۔ میں پہلے جس حبیب کا ذکر کر رہا ہوں اس غریب کا چہرہ ذرا سا چپٹا تھا، چنانچہ یہ لفظ اس کے نام کے ساتھ چپک گیا۔ انتہا تو اس وقت ہوئی جب ایک رات راولپنڈی میں حکومت کے پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے انگریز سربراہ کا فون آیا جس کا نام غالباً ڈگلس تھا۔ فون پر اس نے کہا Can I speak to Mr. Chapta۔ میری انگریزی اچھی ہوتی اور لمبے جملے ادا کرنے کی استعداد ہوتی تو میں کہتا کہ معاف کیجیے، میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میں نے صرف یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ وہ دفتر میں نہیں ہیں۔ اس نے گھر کا فون نمبر اس لیے نہیں پوچھا کہ اس وقت گھروں میں ٹیلی فون لگوانے کا رواج نہیں تھا اور موبائل فون ایجاد ہونے میں ابھی آدھی صدی باقی تھی تو میں اس حبیب کو ج یا چ نہیں بلکہ (2) کہوں گا۔

حبیب الرحمان (2) کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔ وہ بے حد ذہین صحافی تھے اور خبریں نکال کر لانے اور ان کا تجزیہ کر کے اپنا نتیجہ اخذ کرنے کے ماہر تھے۔ میری اور نیّر کی طرح وہ بھی کنوارے ہی تھے۔ ہوا یہ کہ ہم تینوں اور جنگ کے ہیڈ کاتب رضا کو رہنے کے لیے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ رضا کے ساتھ ان کا کنبہ تھا۔ تینوں نے اپنے وسائل یکجا کر کے وہیں جنگ کے پریس والی گلی میں اچھا خاصا بڑا مکان لے لیا۔ رضا صاحب اور ان کے بال بچے اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ نیچے کا باورچی خانہ صابر نے سنبھال لیا اور کھانے پینے کا نظام بہتر ہو گیا۔ چھٹی والے دن کوئی خاص چیز پکائی جاتی تو حبیب (2) نوٹس لکھ کر باہر دروازے پر لگا دیتے جس پر لکھا ہوتا ''کھانا تیار ہے، مہمان حضرات زحمت نہ کریں۔'' کمبخت پریس والے موقع تاڑ کر آ جاتے اور ہمارا کھانا کم پڑ جاتا تھا۔ اُن ہی دنوں افریقی ملک کانگو کے پہلے وزیراعظم لومبا قتل کر دیئے گئے تو رئیس امروہوی نے اس سانحے پر قطعہ لکھا۔ حبیب اس کے ایک مصرعے میں تحریف کر کے لہک

لہک کر گایا کرتے تھے۔ ''لومبا مر گیا لیکن لومبا یاد آتا ہے۔'' ادھر جمعدارنی کا پیچھا کرنے والوں نے یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔

زندگی بہت آرام سے گزر رہی تھی کہ عجب واقعہ ہوا۔ حبیب (2) کی شادی طے ہوگئی۔ واہ کینٹ میں ایک خاتون تھیں جو لڑکیوں کے کالج میں پڑھاتی تھیں۔ ان کے ساتھ بات پکی ہوگئی مگر یہ دلچسپ رشتہ تھا۔ ایک طرف حیدرآباد دکن کا لڑکا، دوسری جانب سرزمین پنجاب کی لڑکی لیکن ان میں ایک قدر مشترک تھی۔ دونوں کی عمریں ذرا آگے کو بڑھ گئی تھیں۔ خدا نے دونوں کی مشکل آسان کی۔ شادی ہوئی۔ رخصت ہوکر دلہن اپنے دولہا کے ساتھ مری چلی گئی۔ دوا فروش دوست نے چلتے ہوئے اپنے یار کے ہاتھ میں دو ایک دوائیں تھما دیں۔ سچ ہے، دوست وہی ہے جو وقت پر کام آوے۔

جب تک دولہا دلہن ہنی مون سے واپس آتے، میں نے اور نیّر نے مکان خالی کر دیا اور ہم ایک عارضی فلیٹ میں منتقل ہوگئے۔

حبیب الرحمان (2) جنگ سے وابستہ رہے۔ ان کے بچے ہوئے جو ماشاء اللہ بڑے ہوگئے۔ حبیب ریٹائر ہوکر اسلام آباد منتقل ہوگئے اور جب تک زندہ رہے، جنگ گروپ کے ہفت روزہ اخبار جہاں میں ''اسلام آباد سے ایک خط'' لکھتے رہے۔ میں نے ایک بار انہیں لندن سے ایک خط لکھا۔ جواب نہ آنا تھا، نہ آیا۔ کچھ عرصے بعد ان کے انتقال کی خبر آئی۔ انتظار ہے کبھی اخبار جہاں میں شائع ہو: جنت سے ایک خط۔

حبیب الرحمان (1): یہ وہی حبیب الرحمان ہے جو میرپور آزاد کشمیر کے کسی پرائمری اسکول میں بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے کراچی کے قومی روزنامہ جنگ کا نامہ نگار بن گیا۔ حبیب کی بھیجی ہوئی کشمیر کی خبروں اور ان پر یوسف صدیقی کی لگائی ہوئی سرخیوں نے جو دھوم مچائی سو مچائی مگر اس دوران یہ ہوا کہ حبیب میر خلیل الرحمان سے بہت قریب ہوگیا۔ اُس شخص کے لیے مجھے مناسب لفظ نہیں مل رہا ہے۔ راولپنڈی والے اسے کبھی حبیب جنگی اور کبھی حبیب چکر کہتے تھے۔ وہاں ایک اور لفظ ''کھڑپینچ'' بھی رائج تھا مگر ان سب میں مبالغہ آرائی تھی۔ اسے اپنے کام نکلوانے کا فن آتا تھا اور میر صاحب کو ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی۔ انہوں نے حبیب سے کیسے کیسے کام نکلوائے، حبیب ان کی لمبی فہرست سناتا ہے مگر اس سے جو بڑا کام قدرت نے بھی لیا اور میر خلیل الرحمان نے بھی، وہ کراچی سے سیکڑوں میل دور راولپنڈی سے اخبار جنگ کا شائع ہونا تھا۔

پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اٹھ کر راولپنڈی کے نواح میں جا رہا تھا، یہ خبر پہلے پہل دینے والوں میں حبیب بھی شامل تھا۔

نئے اخبار کی ساری تیاریاں حبیب نے کیں اور جب اخبار اُس کے اپنے شہر میں آ گیا تو اس نے کوئی بڑا منصب نہیں لیا بلکہ حسب معمول رپورٹنگ کرتا رہا۔ رپورٹر ہونے میں اس وقت بھی بڑے فائدے تھے۔ آج بھی ہیں۔ میرا خیال ہے فعال رپورٹر خود بخود راولپنڈی والوں کے بقول کھڑ پینچ ہو جاتا ہے۔

ایک مرحلے پر خدا جانے کیا ہوا۔ دونوں حبیب الرحمان متحد ہو گئے اور انہوں نے مل کر ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالا۔ اس میں لکھنے کا کام حبیب (2) کے ذمے اور اشتہار لانے کا فرض حبیب (1) کے ذمے تھا۔ دیکھتے دیکھتے اشتہاروں کے ڈھیر لگ گئے لیکن دونوں تیز و طرار تھے، یہ جھاگ جلد ہی بیٹھ گیا۔

حبیب (1) پر آئے دن طرح طرح کے الزام لگتے رہتے تھے۔ ایک بار سننے میں آیا کہ اس کے علاقے کے دکانداروں نے اپنی اپنی دکانوں پر اس کی تصویر کے ساتھ نوٹس آویزاں کیے ہیں کہ اس شخص سے کاروبار نہ کیا جائے۔ ایک مرتبہ یہ بھی سنا کہ حبیب سڑک کے کنارے کھڑا تانگے کا انتظار کرتا تھا اور تانگے والے اسے دور سے دیکھ کر اپنا تانگہ موڑ لیا کرتے تھے۔

ہم لوگوں نے راولپنڈی کے تاریخی کمپنی باغ میں جو اب لیاقت باغ کہلاتا ہے کیونکہ لیاقت علی خاں وہیں قتل کیے گئے تھے، نہایت نفیس پریس کلب قائم کیا تھا۔ مقامی انتظامیہ نے صحافیوں پر مہربان ہو کر پریس کلب کی عمارت دی تھی جس میں بہت اچھا ماحول قائم تھا کہ اچانک حبیب الرحمان (1) اپنے دوستوں کے ہمراہ آ کر وہاں نشست جمانے لگے جس میں کبھی تاش کے پتے نکل آتے اور کبھی شراب کی بوتلیں۔ کیسے صاف ستھرے کلب کی فضا کیسی آلودہ ہو گئی۔

کسی مرحلے پر حبیب نے راولپنڈی اور پاکستان کو چھوڑا اور میرپور کے ہزاروں باشندوں کی طرح برطانیہ چلا گیا۔ اس نے برمنگھم سے اردو ہفت روزہ ایشیا جاری کیا۔ میں اس وقت کراچی کے اخبار حریت سے وابستہ تھا اور اس کے رسالے کے لیے خبریں وغیرہ بھیجا کرتا تھا۔ اس دوران مجھے وظیفہ ملا اور میں صحافت کا کورس کرنے برطانیہ گیا۔ میں دو بار حبیب کے دفتر بھی گیا مگر حد ہوتی ہے، مجھے کبھی اس سے اپنی محنت کا معاوضہ مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس نے بھی میرے ہاتھ پر کسی قسم کی کوئی رقم رکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کے ایک بہنوئی تھے جو چلتے وقت

چپکے سے میری جیب میں ایک نوٹ ڈال دیا کرتے تھے۔ بعد میں جب کبھی میں نے حبیب الرحمان کو اس کا خسیس ہونا یاد دلایا، اس نے ہر بار کہا ''چھوڑ و یار۔''

بعد میں حبیب برمنگھم سے لندن آ گیا اور نیا اخبار جاری کیا۔ میرا وہ بی بی سی کا زمانہ تھا۔ بھٹو صاحب کو پھانسی ہونے والی تھی۔ حبیب نے مجھ سے ضیاء الحق کے خلاف بہت سخت اداریئے لکھوائے اور اس مرتبہ مجھے معاوضہ بھی دیا۔ اس کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی والے اس پر مہربان ہوں گے مگر توبہ کیجیے۔

حبیب کا جو آخری بڑا کارنامہ تھا، وہ میر صاحب کی فرمائش پر لندن سے روزنامہ جنگ جاری کرنا تھا۔ بعض لوگ نہیں مانیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزی نہ جاننے کے باوجود اس نے لندن میں ادارہ جنگ قائم کیا اور اخبار کی پیشانی پر پہلی بار جنگ کراچی اور جنگ راولپنڈی کی طرح جنگ لندن لکھا گیا۔

حبیب عرصے تک جنگ لندن سے وابستہ رہا۔ اس دوران میر صاحب چل بسے اور پھر حبیب پر طرح طرح کے الزام لگے۔ اس کی ملازمت جاتی رہی۔ بڑی مقدمہ بازی ہوئی۔ اس وقت تک حبیب بوڑھا اور کمزور ہو چکا تھا۔ اس نے دوسرے اخباروں میں میر خلیل الرحمان کے بارے میں بہت کچھ لکھ کر اپنی دانست میں رازوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھائے مگر خود اس کے اپنے اسٹیج کا پردہ گر چکا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے گوشۂ عافیت میں پناہ لے لی اور اب تک وہیں پناہ گزین ہے۔

اخبار جنگ سے پرانا تعلق رکھنے والے بس یہی دو چار افراد زندہ ہیں۔ اگرچہ یار زندہ ہیں مگر اب وہ پہلی سی صحبت باقی نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت آخری مرحلے میں تھی کہ میرے ایک اور رفیقِ کار حبیب الرحمان بھی 5 ستمبر 2011ء کی صبح لندن میں چل بسے۔ جب کبھی اخبارِ جنگ کی تاریخ لکھی جائے گی حبیب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔

ایس ایم رضوی: پشاور میں جنگ کراچی کا نامہ نگار تھا۔ رضوی اور حبیب الرحمان (1) نے تقریباً ساتھ ساتھ یہ ملازمت اختیار کی تھی اور دونوں ہی اگرچہ نو آموز مگر بہت کام کے نامہ نگار تھے۔ رضوی پہلے پہل فضائیہ میں بھرتی ہوا تھا اور اس کے سارے انداز ہوابازوں جیسے تھے۔ خوش شکل بھی تھا۔ روانی سے انگریزی اور پشتو بولتا تھا۔ مشہور عالم دین علامہ نجم الحسن کراروی کا بیٹا تھا مگر خود ذرا سا بھی ملا نہیں تھا۔ صحافت سے بے پناہ لگاؤ تھا اور کام سیکھنے میں ہمیشہ آگے آگے رہتا

تھا۔ میر صاحب نے پشاور کے قصہ خوانی بازار کے ایک نئے فلیٹ میں اُس کا دفتر کھلوا دیا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ میر خلیل الرحمان اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایس ایم رضوی سے میری دوستی بہت گہری تھی۔ مجھے پشاور دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ ایک رات اخبار کی کاپی بھیجنے کے بعد تقریباً اسی وقت چھوٹنے والی ٹرین میں بیٹھ کر میں پشاور جا پہنچا۔ اجالا ابھی نہیں ہوا تھا اور اچھی بھلی سردی تھی۔ دیکھا کہ رضوی صاحب پتلون کے اوپر صرف ایک سویٹر پہنے پلیٹ فارم پر کھڑے ٹھٹھر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ قمیص وغیرہ نکالتا تو گھر والوں کی نیند خراب ہوتی۔ چلیے آپ کو پشاور کا ناشتہ کراؤں۔ رضوی ہمیشہ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میں نے یہ تکلف اٹھا دیا تھا۔ میں نے کہا: کیا کھلاؤ گے؟ جواب ملا: ٹھنڈی بالائی اور تندور کا پراٹھا۔

رضوی سے میرے تعلقات بہت ہی اچھے تھے۔ وہ اکثر راولپنڈی آتا اور میرے ساتھ ٹھہرتا یہاں تک کہ اس نے میر صاحب سے بات کر کے اپنا تبادلہ کرا لیا اور جنگ پنڈی کے ڈیسک پر ترجمہ کرنے اور سرخیاں جمانے لگا۔ وہ اپنے کام سے لطف اٹھاتا تھا۔ وہی دن تھے جب شاہ ایران کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور ان کی ملکہ فرح دیبا امید سے تھیں۔ یوسف صاحب ان کی ساری خبریں میرے یا رضوی کے حوالے کرتے تھے۔ ہم اکثر اس طرح کی سرخیاں لگاتے: فرح دیبا امید سے ہیں۔ فرح دیبا کا پیر بھاری ہے۔ فرح دیبا کا نام تو ہم یوں لکھتے تھے جیسے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ پھر ایک دن سرخی لگی ”فرح دیبا کے ہاں بچہ ہوا ہی چاہتا ہے۔“ رضوی کا بس چلتا وہ جا کر زچہ خانے کے باہر کھڑا ہو جاتا۔ پھر جیسے ہی خبر آئی کہ ملکہ ایران نے بیٹے کو جنم دیا ہے، رضوی نے کاغذ کے پرزوں پر یہ خبر لکھ لکھ کر وہ پرزے نیچے سڑک پر پھینکنے شروع کر دیے۔

ہمارا بچپن ابھی پوری طرح رخصت نہیں ہوا تھا۔

ہم دونوں نے اپنی تنگ دستی کے باوجود بہت اچھے دن گزارے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ صدر کے علاقے ہاتھی چوک میں ایک ہوٹل کھلا ہے جہاں ایک روپے میں قورمہ اور آٹھ آنے میں چپاتی مل جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم وہیں کھاتے تھے۔ کبھی رات کے کھانے کے وقت دفتر ہی میں آ جاتا تو ان دنوں اندھیرا ہوتے ہی صدر میں سناٹا چھا جاتا۔ عجب ہُو کا عالم ہوتا تھا اور ایک آدھ ہوٹل کے سوا کچھ نہیں کھلتا تھا۔ تب جنگ کے دفتر کے مقابل کھلنے والے ایک ہوٹل میں جا کر ہم بڑی شان سے ایک روپے کے آملیٹ اور آٹھ آنے کی روٹی کا آرڈر دیتے تھے۔ ہم اس ہوٹل

کے ایسے مستقل گاہک تھے کہ بیرے اپنے باورچی سے کہہ کر ہمارے آملیٹ کے اندر کوئی گاڑھا سالن یا بھجیا بھروادیتے تھے۔

پھر رضوی نے دفتر کے خرچ سے ایک چھوٹا سا اطالوی اسکوٹر خرید لیا۔ اب تو ہم لوگوں نے پہاڑوں کی سیریں شروع کر دیں۔ ایک روز مری کے دامن میں لہتراڑ کے جنگل میں جا پہنچے۔ راستے میں پٹرول خریدا۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے لیے بٹوے میں کچھ نہیں ہے۔ جیبیں ٹٹولیں تو وہی ڈیڑھ روپے نکلے۔ غنیمت ہے جنگل میں ایک ہوٹل بھی تھا۔ ایک روپے کا مرغی کا سالن اور آٹھ آنے کی روٹی پر گزارہ کر کے دونوں بھائی ہنستے کھیلتے واپس چلے آئے۔

ایک مرتبہ اُس ذرا سے اسکوٹر پر چڑھ کر ہم ایبٹ آباد کی طرف چلے۔ پہاڑی راستہ تھا اس لیے غریب اسکوٹر ہانپ گیا ہم نے اسے چمکار کر دلاسہ دیا کہ واپسی اتنی ہی آسان ہوگی۔ میں نے رضوی سے کہا کہ چاہے باپ سے قرض لینا پڑے۔ اس بار خالی ہاتھ نہ جانا۔ چنانچہ شملہ پہاڑی کے دامن میں کیفے مونالیزا میں بیٹھ کر ہم نے ایبٹ آباد کے بہترین کیک اور لذیذ پیسٹری کھائی اور پہاڑ کی تازہ ہوا اپنے تن بدن میں اتارتے، راستے بھر یہ گاتے ہوئے آئے "چاہے کوئی مجھے جنگلی کہے۔ یاہو۔"

پھر یہ ہوا کہ میری شادی ہوگئی۔ ہم نے ایک علیحدہ فلیٹ لے لیا اور اپنے بڑے بھائی کے ہاں تربیلا جا کر ہنی مون گزارا۔ اگرچہ اس وقت تک ایوب خان اور ان کے مقرر کیے ہوئے ویج بورڈ کی عنایت سے میری تنخواہ دو سو سے بڑھ کر 323 روپے ہو چکی تھی لیکن گھر سے دور نئے شہر میں گھر بسانا آسان نہ تھا۔ ہمیں رہ رہ کر کراچی یاد آنے لگا اور فخر ماتری مرحوم کی جانب سے پانچ سو کی ملازمت کی پیشکش ملتے ہی ہم نے اپنا سامان باندھا اور اخبار جنگ کی ملازمت اور شہر راولپنڈی کی سکونت ختم کر کے میں اور میری بیوی ماہ طلعت کراچی کو سدھارے۔

معلوم نہیں پھر کیا ہوا۔ ایس ایم رضوی نے بھی جنگ سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ وہ واپس پشاور چلا گیا۔ اس پر کوئی دھن سوار ہو جاتی تو سب کچھ بھول بھال کر اسی میں مگن ہو جاتا۔ اب اسے یہ سوجھی کہ پشاور سے ایک روزنامہ نکالا جائے۔

خدا جانے کہاں سے رقم حاصل کرنے کے بعد وہ نئے اخبار کا ڈیکلریشن لینے متعلقہ دفتر چلا گیا۔ وہ اپنے اخبار کے جتنے نام سوچ کر گیا تھا، ان ناموں کے ڈیکلریشن پہلے ہی لیے جا چکے تھے۔ دفتر والوں نے کہا کہ کوئی اور نام سوچ کر بتاؤ۔ رضوی نے کہا: جدّت۔

ڈکلیریشن مل گیا۔ روزنامہ جدت شائع ہونے لگا۔ رضوی اس کا نہ صرف ایڈیٹر بلکہ مالک بھی تھا۔ اس نے عملہ بھرتی کیا جن میں لڑکیاں بھی تھیں۔ بس یہی شعبہ ہمیشہ سے اس کی کمزوری تھا۔ کسی سے گہرا جذباتی لگاؤ ہوا۔ سننے میں آیا کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے اور اخبار اپنے لڑکوں کے حوالے کر کے کہیں اور چلا گیا ہے۔

پھر خبر آئی کہ بیمار ہے۔ اس کے بعد اطلاع ملی کہ ہمارا مجنوں مر گیا ہے۔

مجھے یقین ہے اب جنگل اداس ہوگا۔

ایم آفتاب: آفتاب ہم سب کا ہم عمر تھا البتہ وزن میں ہم سے ذرا زیادہ بھاری تھا۔ اسے مقامی طور پر ڈپلومیٹک رپورٹر بھرتی کیا گیا تھا۔ نہایت اسمارٹ تھا۔ خوش مزاج تھا۔ تیز رفتار تھا۔ اپنا پورٹیبل ٹائپ رائٹر اٹھائے دوڑا کرتا تھا۔ ادھر کوئی خبر ملی، ادھر اس نے ٹائپ رائٹر کھولا اور خبر ٹائپ کرنے پر جٹ پڑا۔ اردو بالکل بچوں جیسی لکھتا تھا۔ سارا کام انگریزی میں کرتا تھا۔ دھڑلے سے انگریزی بولتا تھا اور غیر ملکیوں سے خوب نمٹتا تھا۔ میرا اور آفتاب کا مزاج بہت ملتا تھا۔ ہم دیر تک اپنے دلوں کی باتیں کر لیا کرتے تھے۔ اس کی محبوبہ ایبٹ آباد میں تھی جو اتفاق سے میرا محبوب شہر تھا۔ اپنی محبوبہ کو Lady Love کہتا تھا۔ ایک بار ایبٹ آباد پر ایک فیچر لکھ کر لایا جس کے ساتھ تصویریں بھی تھیں۔ جنگ میں اس کے چھپنے کی شرط یہ تھی کہ مسٹر عابدی اس کا ترجمہ کریں گے۔ میں نے کیا۔ کہنے لگا کہ یہ اصل فیچر سے زیادہ اچھا ہے۔

آفتاب کبھی کسی نیوز ایجنسی میں کام کر چکا تھا جہاں سے خبریں دقیانوسی ٹیلی پرنٹر پر بھیجی جاتی تھیں۔ اس خیال سے کہ راہ میں کوئی حرف غائب نہ ہو جائے، تنہا حروف تین تین بار ٹائپ کیے جاتے تھے۔ مثلاً ایم آفتاب کو وہ ہمیشہ ایم ایم ایم آفتاب لکھتا تھا۔ میں اسے اسی نام سے پکارتا تھا مگر اس نے مجھے کبھی آر آر آر اے اے اے عابدی کے نام سے نہیں پکارا۔ اچھا کیا۔

آفتاب بعد میں کہیں چلا گیا۔ پتا چلا کہ ابھی خیر سے زندہ ہے۔ البتہ اور زیادہ موٹا ہو گیا ہے۔ خدا جانے اس پر اس کی Lady Love کیا کہتی ہوں گی۔ وہ جو بھی کہیں، میں تو یہی کہوں گا کہ میرا ایبٹ آباد کا جوان خوش رہے۔

افضل پرویز: افضل پرویز ہمارے کرائم رپورٹر یعنی جرائم کی خبریں دینے والے اسٹاف رپورٹر تھے۔ خدا جانے ان پر یہ ذمے داری کس نے کیا سوچ کر ڈالی۔ وہ غریب تو علاقے کی تاریخ، روایات، رسم و رواج، ناچ گانے، گھریلو صنعتوں، لباس اور پہناوے، لوک گیتوں اور

قصے کہانیوں کے ماہر تھے۔ علاقے کی قدیم بولی پوٹھو ہاری کہلاتی ہے اور افضل پرویز پوٹھو ہاری میں مقبول شاعری کرتے تھے۔ وہ دیکھنے میں بھی کرائم رپورٹر نہیں لگتے تھے اور اوپر سے غضب یہ کہ ان دنوں جرائم ہوتے ہی نہیں تھے۔

افضل پرویز دن ڈھلتے وقت دفتر آتے تھے۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری کا وہ صفحہ کھولتے جس پر راولپنڈی اور نواح کے سارے تھانوں کے نمبر درج ہوتے تھے۔ پھر وہ ایک ایک تھانے کو فون کرتے اور اپنے کچھ پنجابی اور کچھ پوٹھو ہاری لہجے میں ایک ہی سوال کرتے: جی کوئی وقوعہ ہوا ہے؟ جی کوئی خبر ہے۔ ہر تھانے سے ایک ہی جواب ملتا۔ "نہیں جی۔" اس کے بعد افضل پرویز اپنا قلم بند کر کے جیب میں رکھتے۔ کمر سیدھی کرتے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ "عابدی صاحب کل بری شاہ لطیف تک ڈالی جائے گی۔ لوگ چڑھاوے لے کر ناچتے ہوئے مزار تک جاتے ہیں۔ دیکھنے کے قابل منظر ہوتا ہے۔ آپ ضرور جایئے گا۔"

اور میں جاتا تھا۔ مارگلہ کے دامن میں وہ سارا علاقہ مجھے بہت پسند تھا جہاں اب اسلام آباد جیسا شہر سر اٹھائے کھڑا ہے۔ ان ٹیلوں اور پہاڑی نالوں کے پچھواڑے دو گاؤں تھے۔ ایک اپنے مٹی کے برتنوں کی صنعت کی وجہ سے مشہور تھا اور دوسرے میں امام بری شاہ لطیف مدفون تھے۔

افضل پرویز کو ان تمام میلوں ٹھیلوں کی خبر تھی۔ خود بھی ان میں جاتے تھے اور میرا خیال ہے اپنے پوٹھو ہاری گیت گا کر سنایا کرتے تھے۔

ایک دن انہوں نے اپنا قصہ سنایا۔ ہوا یہ کہ انہوں نے ایک پنجابی گانا لکھا اور اس کی چلتی ہوئی طرز بھی بٹھائی۔ پھر وہ اسے لے کر لاہور کے کسی فلم ساز کے پاس گئے۔ اس نے افضل پرویز کو بٹھایا۔ اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ان سے ان کا گانا سنا: "کاگا والیو۔ نام جپو۔ مولانا نام۔ نام مولا نام۔"

فلم ساز نے کسی طرح افضل پرویز کو چلتا کیا۔ فوراً ہی اس کی ٹیم لگ پڑی۔ ان ہی بولوں اور اسی طرز کی ریہرسل ہوئی اور ایک مشہور گانے والے کی آواز میں ریکارڈنگ کر کے راتوں رات گانا فلم میں ڈال دیا۔

افضل پرویز کو عرصے تک اس کا صدمہ رہا۔

اب وہ دنیا کے سارے صدموں سے نجات پا چکے ہیں۔

شاید ان کے علاقے کے تھانے کو اس وقوعہ کی خبر بھی نہ ہو۔

منظور جعفری: ہمارے بہت اچھے ساتھی تھے۔ خوبیوں کے مالک تھے۔ صحافی نہ ہوتے تو کچھ اور ضرور ہوتے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ان میں وہ دھواں دھار کام کر کے آگے بڑھنے کی لگن نہیں تھی۔ ایک بار لندن میں ان کا خط موصول ہوا۔ لکھا کہ میرا بیٹا بی بی سی سے وابستہ ہو گیا ہے اور لندن آ رہا ہے۔ گویا ان کا بیٹا ان سے تیز نکلا۔ منظور جعفری صحافت کو خیر باد کہہ کر فلم سازی کی طرف نکل گئے۔ پتا نہیں اس میں کتنے کامیاب ہوئے البتہ مجھے یہ پتا ہے کہ پھر وہ خاموشی کے ساتھ اِس جہاں سے سدھار گئے۔

رفیع الزماں زبیری: یوں تو وہ ریڈیو پاکستان میں خبروں کا ترجمہ کرتے تھے لیکن شام کو اخبار میں جز وقتی کام کیا کرتے تھے۔ ایسے شریف النفس لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ بہت نرم گفتار تھے۔ اسی مناسبت سے بہت خوش خط تھے۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنی بیٹی نیّر علوی سے بیاہ دی۔ بعد میں وہ بھی کراچی چلے گئے اور حکیم سعید اور ان کے ہمدرد دواخانے سے وابستہ ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ حکیم صاحب نے بچوں کے رسالے اور کتابیں چھاپنے کا جو سلسلہ شروع ہوا زبیری صاحب نے اس میں ہاتھ بٹایا۔ یہ سلسلہ مسعود احمد برکاتی صاحب کے دم قدم سے اب تک جاری ہے لیکن رفیع الزماں زبیری صاحب اللہ کو پیارے ہوئے۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں کے بارے میں شان الحق حقی صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ فرشتہ صفت ہوتے ہیں۔ زبیری صاحب اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

شاہد، فوٹو گرافر: جنگ پنڈی کے فوٹو گرافر شاہد بھی کراچی سے گئے تھے۔ سرخ و سفید اور خوش شکل۔ انہیں فوٹو گرافی کے بجائے ماڈل ہونا چاہیے تھا۔ آخر میں جنگ لندن سے وابستہ ہوئے۔ اب تک یہیں آباد ہیں۔ دعا ہے کہ آباد رہیں اور شاد رہیں۔

احسن صاحب، اکاؤنٹینٹ: ان کے بغیر جنگ راولپنڈی کا ذکر مکمل نہیں ہو سکتا۔ احسن صاحب نہایت اچھے حساب داں اور میر صاحب کے بہت معتمد تھے۔ ہم لوگوں کی تنخواہیں دیکھتے دیکھتے نمٹ جاتی تھیں۔ اس کے بعد سارا کام احسن صاحب کے دیے ہوئے ایڈوانس سے چلتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ تنخواہ ماہ بہ ماہ کم ہوتی جاتی تھی۔ ہاں سال کے آخر میں بونس ملتا تھا۔ ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر بونس کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ میر صاحب، جو نیا کاروبار شروع کرتے وقت کہیں روپوش ہو جاتے تھے، بونس ادا کرتے وقت نمودار ہوتے تھے اور یہ نقد رقم اپنے ہاتھ سے

دیتے تھے۔ ایک بہت وسیع اور کشادہ کاغذ پر ہر ایک کے نام اور رقم کا اندراج ہوتا تھا۔ ہر شخص اپنے خانے میں دستخط کرتا جاتا تھا، رقم لیتا جاتا تھا اور میر صاحب کو سلام کرتا جاتا تھا۔

بس ایک بات تھی، اس وسیع اور کشادہ کاغذ پر ہم لوگوں کے نام تو سیاہی سے لکھے جاتے تھے البتہ رقم پنسل سے بھری جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

احسن صاحب نے مجھ پر ایک اور کرم کیا۔

ہوا یہ کہ جب مجھے بڑی بھاوج کے گھر میں رہتے اور آرام کی زندگی گزارتے کئی مہینے ہو گئے تو بھائی نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ چند روز پیر ٹکانے تک تو ٹھیک ہے مگر تم تو یہیں رہ پڑے ہو۔ اس گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالتے ہو؟

اگر ڈالتا تھا تب بھی یوں کہیں ڈیرے ڈال لینا بری بات تھی۔ میں نے خاموشی سے اپنا مال اسباب سمیٹا اور سامنے ہی کالج روڈ کے ایک چھوٹے سے سستے ہوٹل میں چلا گیا جہاں میری طرح ملازم پیشہ لڑکے رہا کرتے تھے۔ مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا جس میں ہوا کا گزر نہیں تھا۔ غضب کی گرمی تھی اور جہاں رات ہوتے ہی کھٹملوں کی بھوکی فوج اپنے مہمان پر ہلا بول دیتی تھی۔ میں نے احسن صاحب سے ذکر کیا۔ اگلے روز انہوں نے بتایا کہ ان کے پڑوسی چودھری صاحب جو دودھ کا کاروبار کرتے تھے اپنے گھر کی بیٹھک کرائے پر دینے کے لیے تیار ہیں۔

میں نے ایک لحہ بھی ضائع نہیں کیا اور چودھری صاحب کی بیٹھک میں ڈیرا ڈال دیا۔ میں مٹی کے تیل کا ایک چولہا لے آیا اور پھر جو دودھ کی نہریں بہیں، وہ عمر بھر یاد رہیں گی۔ چودھری صاحب کا ملازم صبح سویرے آ کر تازہ تازہ، بالکل خالص اور گاڑھا دودھ دے جاتا تھا۔ میرا معدہ اصلی چیزوں کا عادی نہ تھا۔ اس نے دودھ ہضم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ میں نے اس میں پانی ملانا شروع کر دیا۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اب وہ دودھ کہاں سمائے۔ چودھری صاحب کی بیٹھک میں ٹوائلٹ نہیں تھا۔ ان کے گھر میں داخلے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو ان کے گھر کے سامنے بڑا سا کھیت تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ کھیت میں چلے جایا کرو۔ میں نے بڑی سی گردن ہلا دی۔ میرا صاف انکار دیکھ کر احسن صاحب نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کہ میں ان کے گھر میں چلا جایا کروں۔ اب خواتین والے گھر میں ایک صاحب لوٹا اٹھائے پہنچ جائیں۔ مجھے یہ بھی منظور نہ تھا۔ اس سے تو سامنے والا کھیت کیا برا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ میں سویرے سویرے جنگ کے دفتر کی طرف لپکتا۔ وہیں کیفے سیروز میں توس اور آملیٹ کا ناشتہ کرتا اور دو گھنٹے اِدھر اُدھر گزارنے کے بعد ڈیوٹی پر پہنچ جاتا۔

اسی دوران نیّر علوی کو کرائے کا مکان مل گیا مگر اس میں ایک حصے دار کی ضرورت تھی۔ مجھ سے بہتر امیدوار کون ہوگا۔ میں جھٹ رضامند ہو گیا اور دودھ والے چودھری صاحب کی بیٹھک چھوڑ کر گوالمنڈی والے مکان میں منتقل ہو گیا۔ دودھ تو یہاں بھی تازہ ملتا تھا مگر اتنا گاڑھا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے غنیمت جانا۔

پھر یہ ہوا کہ حبیب الرحمان (2) کو بھی مکان کی ضرورت پڑی۔ اب ہم تینوں نے ہیڈ کاتب رضا کو ساتھ ملا کر ایک بڑا مکان لے لیا اور چین کی زندگی گزاری۔ حبیب الرحمان خیر سے اپنی دلہن بیاہ کر وہیں لائے اور وہ گھر صحیح معنوں میں آباد ہوا۔

الیاس، رضا اور دوسرے کاتب: خوب تھی یہ مخلوق بھی۔ کیا زمانہ تھا کہ ان کے بغیر اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں نکل سکتا تھا۔ اخباروں میں تو کاتبوں کی فوج کام کرتی تھی۔ ان کی تنخواہیں کم تھیں۔ کئی کئی گھنٹے کتابت میں دیدہ ریزی کیا کرتے تھے اور پورے نظام میں ان کا مقام کچھ اعلیٰ نہیں تھا۔

جنگ پنڈی کے شروع کے دنوں میں کاتبوں کا حال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اخبار کا دفتر، صدر میں اور ان لوگوں کی رہائش کم سے کم دو میل دور پرانی آبادی میں تھی۔ دن کے اوقات میں تو یہ تانگوں، بسوں یا ویگن میں بیٹھ کر دفتر آجاتے تھے مگر رات کو کام ختم کر کے پنڈی کے جاڑوں میں پیدل مارچ کرتے ہوئے گھروں کو جاتے تھے۔ پہلی یا دوسری رات کا واقعہ ہے۔ کاتبوں کا غول کا غول دفتر سے اتر کر نیچے سنسان پڑی ہوئی سڑکوں پر پیدل چلا تو پولیس والے حیران ہوئے۔ انہوں نے اِس مجمع سے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو۔ انہیں جواب ملا کہ اتنی رات گئے اگر کوئی یوں سڑک پر نظر آئے تو سمجھئے کہ وہ یا تو اخبار والا ہوگا یا کتا ہوگا۔

اس کے بعد پولیس والوں سے ان کی دوستی ہوگئی۔

اس مرحلے پر مجھے وہ رات یاد آئی جب آخری کاپی پریس بھیج کر کاتب اپنے ٹھکانے کو سدھارے اور میں کمپنی باغ کی طرف چلا۔ رات کا سناٹا تھا۔ سڑکوں پر ہو کا عالم تھا۔ میں نالہ لئی کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ فوج نے تیز روشنی کی ہوئی ہے اور فوج والے کسی کارروائی میں مصروف ہیں۔ میں پل کے اوپر چڑھ رہا تھا کہ دیکھا، ذرا نیچے نالے کے کنارے عرصۂ دراز سے

نظر آنے والی لکڑ شاہ کی قبر کے گرد قناتیں کھڑی ہیں۔اس قبر پر تو لوگ چادریں چڑھاتے نظر آتے تھے۔میں نے سوچا کہ شاید فوج والے کسی محاذ پر کامیابی کے لیے پیر لکڑ شاہ کی قبر پر منت مراد لے کر آئے ہیں۔

اگلی صبح پتا چلا کہ فوج نے میت کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے رات کے دوران قبر کھولی تھی۔اس کے اندر سے انسان کے قد کے برابر لکڑ نکلا۔

پیر صاحب کے برآمد ہونے کا فیض یوں ظاہر ہوا کہ اس کے بعد نہ صرف نالہ لئی کا پل کشادہ ہوا بلکہ تاریخی مری روڈ بھی دوگنی چوڑی ہوگئی۔

میں دوبارہ آتا ہوں اپنے خوش نویسوں کی طرف۔

الیاس صاحب کراچی میں ہیڈ کاتب تھے۔وہ راولپنڈی میں اپنا شعبہ جمانے کے لیے آئے تھے۔بعد میں لمبی کاکلوں اور سیاہ داڑھی والے رضا صاحب، ہیڈ کاتب بنے۔انہوں نے مجھے، نیر اور حبیب کو ساتھ ملا کر گوالمنڈی میں جنگ کے پریس کے قریب بڑا دومنزلہ مکان لے لیا تھا۔

یہ سب اچھے ملنسار لوگ تھے۔ان سب میں ایک خوبی مشترک تھی۔کوئی کتنا ہی بدخط ہو، یہ اس کی لکھائی پڑھ لیتے تھے لیکن ان میں ایک خرابی مشترک تھی۔جب یہ کتابت کر رہے ہوتے تھے، ان کا ذہن کہیں دور ہوتا تھا اور انہیں کم ہی معلوم ہوتا تھا کہ کیا لکھ رہے ہیں۔میں اکثر کہا کرتا تھا کہ کاتب جو کچھ لکھتے ہیں اسے ذہن نشین بھی کرلیں تو ان سے بڑا عالم شاید ہی کوئی ہو۔

پھر یہ ہوا اور اچھا ہی ہوا کہ کمپیوٹر کتابت کرنے لگا۔کوئی بھی شخص کہیں بھی بیٹھ کر ہزار صفحے کی کتابت کرسکتا ہے اور اول سے آخر تک اس کتابت میں کیا مجال کہ کہیں کوئی ذرا سا بھی فرق ہو۔

بس غلطیاں کاتب بھی بہت کرتے تھے، کمپیوٹر بھی بہت کرتا ہے۔

محمد حسین: جنگ وہ واحد اخبار تھا جس کے کراچی اور راولپنڈی کے دفتروں کے درمیان چوبیس گھنٹے ٹیلی پرنٹر کا رابطہ رہتا تھا۔لمحہ بھر میں خبروں کی ترسیل ہوجاتی تھی اور ضروری معاملوں پر گھڑی بھر میں تبادلہ خیال ہوجاتا تھا۔پنڈی میں اس ٹیلی پرنٹر کے آپریٹر محمد حسین تھے۔میرے بہت اچھے دوست تھے اور خبروں کی ترسیل میں دوسرے کام چھوڑ کر میری مدد کرتے تھے۔محمد حسین کا تعلق بلتستان کے قصبے چلو سے تھا۔ان کا ناک نقشہ بھی کچھ کچھ بلتی تھا۔بہت ہنس مکھ تھے

اور اپنا ٹیلی پرنٹر چلانے کے ساتھ ساتھ دفتر کے دوسرے کام بھی ہنسی خوشی کر دیا کرتے تھے۔

اب خدا جانے کہاں ہوں گے۔ ایک بار بی بی سی لندن میں ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے ایک سینئر پروڈیوسر آئے اور ایشیائی شعبوں کے سربراہ ولیم کرالے سے رابطہ کیا۔ سینئر پروڈیوسر تو یہاں بڑی شے ہوتا ہے۔ ولیم نے انہیں مرکزی لندن کے ایک شاندار کلب میں دوپہر کے کھانے پر بلا لیا۔ میں اور اطہر علی مرحوم بھی مدعو تھے۔ اب جو سینئر پروڈیوسر تشریف لائے، وہ غریب چپلو کے دیہاتی نکلے۔ تب پتا چلا کہ وہ محمد حسین کے بیٹے تھے۔ ولیم تو بے مزہ ہو کر دو چار لقمے کھا کر چلا گیا۔ اطہر صاحب حسب عادت نوجوان کی دلجوئی کرتے رہے۔

ضلعی نامہ نگار: ہوا یہ کہ مجھے اس صفحے کا نگران بنا دیا گیا جس پر مختلف ضلعوں، شہروں، قصبوں اور دیہات کی خبریں چھپا کرتی تھیں۔ اس طرح میری زندگی میں ایک نئی کھڑکی کھلی۔ علاقے بھر میں سرگرم نامہ نگار براہِ راست میرے ماتحت بن گئے اور اس سے بھی زیادہ وہ میرے دوست ٹھہرے۔

وہ جو پہاڑ مجھے بہت عزیز تھے اور مجھے راولپنڈی بلا رہے تھے، اب وہ میرے قریب آ گئے۔ میرے پسندیدہ شہر ایبٹ آباد کے غلام جان خاں طاہر خیلی اور آزاد کشمیر کے نامہ نگار اعلیٰ سرشار اختر ملک کو میرے کوہ نوردی کے شوق کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ چھٹیوں کے دنوں میں انہوں نے میری میزبانی کی ذمے داری سنبھال لی۔

ایبٹ آباد کے غلام جان خاں طاہر خیلی ادھیڑ عمر تھے اور شہر میں ایک اونچے مقام پر لکڑی کے بنے ہوئے ٹین کی چھتوں والے ایک ایسے قدیم مکان کے مالک تھے جس کے برآمدے سے ایبٹ آباد کی پوری وادی نظر آتی تھی۔ اس وقت سامنے کے پہاڑوں پر جنگل موجود تھے اور درخت کاٹے نہیں گئے تھے۔ نیچے سرسبز وادی میں انڈے جیسی سفید الیاسی مسجد موتی کی طرح درخشاں تھی۔ شہر کو فوجیوں نے چندن بنا رکھا تھا۔ انگریزوں کے زمانے کی آن بان بدستور باقی تھی اور شملہ پہاڑی کے دامن میں ہشت پہلو مونا لیزا ریسٹورنٹ میں گرم پیالیوں میں انڈیلی جانے والی بھاپ اڑاتی ہوئی چائے ایبٹ آباد کی دھیمی دھیمی ٹھنڈک میں روح کو تڑپاتی ہو یا نہ تڑپاتی ہو، قلب کو گرماتی ضرور تھی۔

رات کو طاہر خیلی صاحب گھر کی بالائی منزل کے کشادہ برآمدے میں میرا بستر لگا کر مجھے اتنا وزنی لحاف اڑھا دیتے تھے کہ آدمی اس میں سے نکلنا چاہے تو کسی کو مدد کے لیے پکارے۔

رات گھنی ہو جاتی تو سوچیے کیا ہوتا۔ مکان کی ٹین کی چھت پر پہلے بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرتیں۔ اس کے بعد ایسی جھما جھم بارش ہوتی کہ نہ صرف سونے والا بلکہ اس کو آنے والی نیند، دونوں مل کر جھومتے۔ پھر کسی وقت بارش تھم جاتی۔ دن کا اجالا نمودار ہوتا اور میں سر اونچا کر کے نیچے وادی کو دیکھتا تو اس میں ہمارے گھر سے بھی نیچے بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی ہوتیں۔ الیاسی مسجد ہر رات نہا کر اور زیادہ نکھر جاتی۔ آنکھیں خود کو بند کر لیتیں تاکہ یہ منظر محفوظ ہو جائے۔

ہمارا دوسرا پہاڑی دوست آزاد کشمیر کا سرشار اختر ملک تھا۔ جنگ کا نامہ نگار ہوتے ہی انسان کچھ سے کچھ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاراجا چلے گئے، ان کی جگہ سرشار تم آ گئے۔

بھاری بھرکم تھے۔ رنگ اُجلا تھا۔ عمر ایسے مقام پر تھی کہ اسے نہ کم کہا جائے اور نہ زیادہ۔ بلا کے مہمان نواز تھے۔ پہلے پہل سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہراتے تھے۔ قربت بڑھی تو اپنے پرانی وضع کے گھر میں ٹھہرانے لگے۔ وہاں ٹھہرنے میں اتنا لطف نہیں تھا جتنا وہاں نہانے میں تھا۔ ان کے مکان کے دامن میں اور کافی گہرائی میں دریا بہتا تھا۔ نیچے اتر کر وہاں جائیے تو دریا کے کنارے بنے ہوئے غسل خانے ملتے تھے۔ ان میں دروازہ نہیں ہوتا تھا۔ دیوار پر اپنا تولیہ ڈال دیجیے۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی ہے اور دیوار کی آڑ میں نہا رہا ہے۔

وہ نہانا تو بس غضب تھا۔ پہاڑی چٹانوں سے پائپ کی ٹوٹیاں نکلتی تھیں جن سے ٹھنڈا، میٹھا، تازہ، فرحت افزا پانی دن رات بلا روک ٹوک بدن پر گرتا تھا اور پھر جو غسل کا لطف آتا تھا، وہ اٹیچڈ باتھ روم، شاور اور واش روم والے کیا جانیں۔

ایک بار یہ ہوا کہ کراچی سے میری نوعمری کے دوست غازی صلاح الدین بھی آ گئے۔ ہمارے ساتھ مل کر سرشار اختر ملک بھی اپنے تن و توش کے باوجود نوعمر بن گئے اور ہم نے صحت افزا پہاڑی مقام چکار جانے کا فیصلہ کیا۔ دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ سرینگر کو جانے والی سڑک پر ایک جگہ ہم تینوں بس سے اترے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع چکار اور اس کے ریسٹ ہاؤس کو جانے والی بل کھاتی اور پختہ سڑک برساتی نالوں کی زد میں آ کر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور اوپر جانے کا واحد راستہ وہ پگڈنڈی تھی جس پر چکار کی ساری آبادی کی آمد و رفت جاری تھی۔

اس راستے پر ہم بھی چلے۔ ہم کیا چلے ساتھ ایک قیامت چلی۔ سرشار اختر ملک پگڈنڈی کے تصور ہی سے ہانپنے لگے۔ وہ چند قدم چلتے اور کسی چٹان پر بیٹھ کر ہانپنے لگتے اور ہانپتے ہانپتے مقامی راہگیروں سے پوچھتے جاتے کہ چکار ابھی کتنی دور ہے۔ ہر ایک کا ایک ہی جواب ہوتا

''وہ جو سفید پتھر نظر آ رہا ہے، بس وہاں ہے۔''

ہم ان کی باتوں میں آ جاتے مگر سرشار کی سانسوں کی دھونکنی کے اندر سے نکلتا ہوا ان کا یہ فقرہ ضرور سنائی دیتا کہ یہ سارے جھوٹ بولتے ہیں۔

خدا خدا کر کے ہم اوپر پہنچے اور غازی بولے ''اب پتا چلا کہ اوپر جا کر جن لوگوں کو بہشت ملے گی انہیں کیسا محسوس ہوگا۔'' میں نے وہاں چکار کا قبرستان دیکھا۔ نہایت خوش وضع قبریں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ دفن ہونے والے ہر وقت نیچے وادی کا نظارہ کر سکیں۔ میں نے غازی سے کہا ''جی چاہتا ہے اوپر جانے کا سفر اسی جگہ سے شروع کیا جائے۔''

چھ سال پہلے آنے والے تباہ کن زلزلے میں چکار کی کتنی عورتیں، بچے اور مرد لمحہ بھر میں اوپر چلے گئے۔ پتا نہیں انہیں قبروں میں دفن ہونا بھی نصیب ہوا یا نہیں۔

چکار کا ریسٹ ہاؤس نئی اور جدید عمارت میں بنا تھا۔ نہایت عمدہ فرنیچر تھا اور شیشے کی الماریوں میں چینی کے خوبصورت برتن چنے تھے۔ سرشار اختر ملک نے جاتے ہی سارے عملے اور باورچیوں کو طلب کر کے ضروری احکامات دیے۔ وہ خود تو بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ میں اور غازی دیر تک پہاڑی پگڈنڈیوں پر گھومتے رہے۔

واپسی کا سفر آسان تھا۔ ہم چلتے ہوئے اور سرشار لڑھکتے ہوئے نیچے سڑک تک اتر آئے۔ وہیں مظفر آباد کی بس مل گئی۔ ہم اس میں بیٹھے تو سرشار اصرار کر کے کھڑکی کے قریب بیٹھے۔ انہوں نے اس کا سبب نہیں بتایا۔ پھر ہوا کہ اگلے پڑاؤ پر بس رکی اور گاؤں والے فروخت کے لیے زندہ مرغیاں لے آئے جن کی ٹانگیں بندھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بارہ روپے مانگے۔ سرشار نے آٹھ میں سودا طے کر کے ایک مرغی لے لی اور اسے فرش پر ڈال کر ٹانگوں میں دبوچ لیا۔ بیچاری نے ذبح ہونے تک چوں بھی نہیں کی۔

ایک بار مجھے سرینگر روڈ پر واقع ایک بستی میں لے گئے جس کا نام گڑھی دوپٹہ تھا۔ وہاں کی خوبی یہ تھی کہ وہاں جرم نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اس پر ایک فیچر لکھا: امن کی بستی۔ گڑھی دوپٹہ۔

ایک مرتبہ تو غضب ہی ہوا۔ میں اور سرشار بس میں بیٹھ کر وادی نیلم کی سڑک پر گئے اور ایک جگہ بس سے اتر گئے۔ وہاں سے پیدل چل کر ہمیں ایک اور بستی میں جانا تھا جس کا نام گھوڑی تھا۔ وہاں کے رئیس جو مظفر آباد کے سرکردہ تاجر تھے، ہمارے میزبان تھے۔ راہ میں ایک چھوٹی سی ندی ملی جس پر کوئی پُل نہ تھا۔ دیکھا کہ گھوڑی کے رئیس کے ملازم کھڑے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ وہ ہمیں کندھوں پر اٹھا کر ندی پار کرائیں گے۔ مجھے تو جس نے اٹھایا اسے اللہ میاں کبھی نہ اٹھائے لیکن رئیس کے جس ملازم نے سرشار اختر ملک کو کندھوں پر اٹھایا گویا دنیا کا سارا عذاب اس کے کندھوں پر رکھ دیا گیا۔ ندی پار کر کے وہ لوگ تو رئیس کی کوٹھی تک کندھوں ہی پر لے جانا چاہتے تھے مگر ہم مچل گئے۔ تھوڑا سا ہی فاصلہ تھا جو ہم نے پیدل طے کیا۔ رات ہونے لگی تو وہی ملازم ہماری ٹانگیں دبانے آ گئے۔ ہم خاموش پڑے دبواتے رہے لیکن صبح جب آنکھ کھلی اور بستر سے اترے تو وہی ہماری ٹانگیں پھوڑا ہو چکی تھیں۔ ٹانگوں کا یہ حال تھا کہ ؎

درد بڑھتا گیا جوں جوں دبا کیں

سرشار اختر ملک کسی زمانے میں لاہور میں رہتے تھے۔ وہاں خدا جانے کس سے کوئی مرض لگا لائے۔ اس کی تکلیف کا کبھی انہوں نے اظہار نہیں کیا لیکن اپنی فربہی کی بھی پروا نہیں کی۔ جلد ہی مر گئے۔ پتا نہیں چکار میں دفن ہوئے یا کہیں اور۔

نتھیا گلی کا دادن: ضلع ہزارہ کے ان مقامات میں جو گلیات کہلاتے ہیں، ہمارا کوئی نامہ نگار نہیں تھا۔ چنانچہ وہاں مجھے کسی میزبان کے بغیر جانا پڑا۔ وہاں جانا کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ راولپنڈی صدر میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کی مضبوط، مستعد اور روپہلی بسیں ہر جانب جاتی تھیں اور ارزاں تھیں۔ مری، نتھیا گلی یا ایبٹ آباد کا کرایہ چار روپے سے زیادہ نہ تھا اور پھر یہ بسیں اس شان سے چلتی تھیں کہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کرتا تھا: فلاں علاقے کو جانے والی بس بے نمبر فلاں میں تیار کھڑی ہے۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ اپنی نشستوں پر تشریف رکھیں۔

مری تو میں بار بار گیا۔ سنہ ساٹھ، اکسٹھ تک مری ویسا ہی تھا جیسا انگریز چھوڑ کر گئے تھے۔ وہی مال روڈ، وہی کشمیر پوائنٹ، وہی پوسٹ آفس یہاں تک کہ وہی ریسٹورنٹ، ان میں ویسے ہی سفید وردی پوش بیرے، ویسی ہی ولایتی کراکری، چاندی جیسے چھری کانٹے اور ہمیشہ جیسی عمدہ چائے اور پیسٹری۔ ایک ہوٹل میں نہایت لذیذ قیمہ پالک ملتا تھا اور گرم چپاتی اس وقت آتی تھی جب آپ ہاتھ دھو کر اور بسم اللہ کہہ کر بیٹھتے تھے۔ کچھ دیر بعد بیروں کی خوشامد کرنا پڑتی تھی کہ ہم مانگیں تب بھی اور چپاتی مت لانا۔

ایک اور بے مثال جگہ مری کے قریب بھوربن تھی جو اتنی دلکش تھی کہ فلموں کی شوٹنگ کے لیے اس سے بہتر جگہ بس نتھیا گلی ہی ہو سکتی تھی۔ وہاں گولف کے شوقین حضرات گولف کھیلنے آتے تھے۔ وہیں، درختوں کے ان ہی جھنڈوں کے اندر انگریزوں کے زمانے کا گولف ہوٹل تھا۔

یوں لگتا تھا کہ یورپ کے کسی پہاڑی علاقے سے لایا گیا ہے۔ وہ ہوٹل دنیا کے ہنگاموں سے اتنی دور تھا کہ وہاں نہ بجلی تھی، نہ ٹیلی فون اور نہ ٹیلی ویژن۔ صبح نہانے کے لیے بیرے گرم پانی کی بالٹیاں لاتے تھے۔ کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں گھنٹی بجتی تھی اور ہر طرف سے خوش پوشاک مہمان لنچ یا ڈنر کے لیے نکلتے تھے۔ ہم نے اپنے دوست غازی صلاح الدین اور صادقہ کو ہنی مون کے لیے اسی ہوٹل میں بھیجا تھا۔ اب انہوں نے وہاں ایک فلیٹ خرید لیا ہے۔

مگر جیسا چین سردار نتھیا سنگھ کی گلی یعنی نتھیا گلی میں تھا اس کی مثال نہیں ملتی۔ نتھیا گلی ایبٹ آباد کو مری سے ملانے والی پہاڑی سڑک پر واقع ہے۔ سڑک پر بازار ہے اور چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں۔ پرانے وقتوں کے شاندار بنگلے، کوٹھیاں اور وائسرائے کا محل اوپر ہے۔

میں جب پہلی بار گیا اور یہ سنہ ساٹھ کی بات ہوگی تو بازار میں بس سے اترتے ہی کئی ہوٹل نظر آئے۔ کمرے کا کرایہ آٹھ روپے تھا۔ میں ایک ہوٹل میں پہنچا جس کے مستعد نگراں کا نام دادن تھا۔ وہ ملازم بھی تھا۔ رکھوالا بھی تھا۔ باورچی بھی تھا اور بیرا بھی تھا۔ اس نے میرا بڑا خیال رکھا۔ میں نے اس کی تصویر اتاری اور اس کا انٹرویو لیا۔ اس نے کہا کہ آپ ایڈیٹر لوگ ہیں، ان سستے ہوٹل میں نہ رہیے بلکہ وہیں رئیس خانہ ہے، ذرا سا مہنگا سہی مگر آپ وہاں آرام سے رہیں گے۔

دادن مجھے رئیس خانے تک لے گیا جہاں ایک نوعمر لڑکے الیاس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ یہ ہشت پہلو عمارت کبھی شاندار رہی ہوگی۔ گرمیوں میں جب کبھی وائسرائے یا گورنر وغیرہ نتھیا گلی جاتے تھے تو ان کا عملہ اس رئیس خانے میں ٹھہرتا تھا۔ اس کی وہ آن بان باقی تھی مگر اس عمارت پر قدامت کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بازار قریب ہونے کی وجہ سے وہاں آرام بہت تھا۔ اس بازار کی خصوصیت بھنی ہوئی سالم مرغی ہوا کرتی تھی اور سنا ہے کہ میر خلیل الرحمان اور ان کے دوست مرغی کھانے نتھیا گلی کے بازار جایا کرتے تھے۔

واپس آ کر اور کراچی میں اخبار حریت سے وابستگی کے بعد میں نے ایک چھوٹا سا فیچر لکھا جس کا عنوان تھا: نتھیا گلی کا دادن۔ پھر بات پرانی ہوگئی۔ سنہ 95ء کے قریب یعنی کوئی 35 سال بعد میرا نتھیا گلی جانا ہوا اور میں نے اپنے ہوٹل میں کام کرنے والے لڑکوں سے پوچھا کہ یہاں ایک شخص دادن ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ دادن انکل سیاحوں اور ان کے بچوں کے پلے گراؤنڈ میں ٹھنڈی بوتلیں بیچتے ہیں۔ میں وہ مقام تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا تو دیکھا کہ کولڈ ڈرنکس کے اسٹال

پر ایک بزرگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ وہ جگہ سونی پڑی تھی، نہ کوئی گاہک، نہ خریدار۔

دادن تو مجھے کیا پہچانتے، میں نے 35 سال پہلے اپنے آنے کا قصہ سنایا اور حال پوچھا۔ ان کا گلا رُندھ گیا۔ بتانے لگے کہ سیاح اور ان کے بال بچے آتے ہیں تو کچھ آمدنی ہو جاتی ہے ورنہ وہ ہیں، ان کی غریبی ہے، بستر سے لگی ان کی بیمار بیوی ہے۔

ان کے دکھ سن کر میرا جی بھی بہت دکھا۔ انہوں نے ٹھنڈی بوتل پلائی اور قیمت لینے سے انکار کرتے رہے۔ بالآخر میں اپنے ہوٹل چلا گیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور میں بند ہوتے ہوئے بازار میں گھوم رہا تھا۔ وہیں سے نیچے گہری وادی کو جانے والی پگڈنڈی شروع ہوتی تھی اور نتھیا گلی کے غریب غرباء کا گاؤں وہیں گہری وادی میں تھا۔ دیکھا کہ دادن نیچے جانے کو ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کیا تھا۔ یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ان کا علاج ہو رہا ہے یا نہیں۔ کہنے لگے: جی ہاں، علاج ہو رہا ہے۔ ہر روز سو روپے کا انجکشن لگتا ہے اور کل کے انجکشن کے پیسے نہیں ہیں۔ میں نے اپنا بٹوہ کھولا اور پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکالنے لگا مگر میری انگلیاں مجھ سے زیادہ دردمند نکلیں۔ دادن نے ایک ہزار کا نوٹ لیا، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر مجھے دعا دی اور تیزی سے نیچے گہری وادی میں اتر گئے۔

روزنامہ جنگ کا دفتر اب اسی شاہراہ پہلوی پر اس کی اپنی عمارت میں ہے جو پہلے کبھی مری روڈ کہلاتی تھی اور اس چوراہے کے قریب ہے جہاں کسی زمانے میں سرینگر کا سنگ میل لگا تھا۔ کسی نہایت غیر رومانٹک حاکم نے اسے اکھڑوا دیا۔ اسی طرح مال روڈ پر جو تاریخی جی ٹی روڈ ہی کا ٹکڑا تھا، وہ بہت بڑا پتھر نصب تھا جس پر راولپنڈی سے کلکتے تک راہ میں پڑنے والے تمام اہم شہروں کا فاصلہ درج تھا۔ کسی نے اسے بھی اکھاڑ پھینکا البتہ سنا ہے وہ کہیں محفوظ ہے۔ بات پتھروں کی نکل آئی تو مجھے وہ سنگ میل یاد رہے گا جو پشاور میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں سے جی ٹی روڈ شروع ہوتی تھی۔ اس پر بڑا سا زیرو کھدا ہوا تھا۔ کسی نے اسے اکھاڑ کر پہلے تو چھوٹے سے نالے کے اوپر ڈال کر اس سے پل کا کام لیا۔ پھر میں نے ریڈیو پر اس کا حال بیان کیا تو اسے اٹھا کر یا تو کہیں چھپا دیا یا اس مشین میں ڈال دیا جو بڑے بڑے پتھروں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

اپنے بزرگوں اور اپنے ماضی کی نشانیوں کو مٹانے کی جیسی مہارت ہمیں حاصل ہے، شاید ہی کسی اور کو ہو۔

---------O---------

کیا کیا آشنا

پرانے زمانوں کو ہر شخص اپنے الگ الگ حوالوں سے یاد رکھتا ہے۔ مثلاً لاہور کو کوئی اس کے باغوں اور کوئی اس کی عمارتوں یا اور کچھ نہیں تو ہیرا منڈی کے تعلق سے یاد رکھتا ہے۔ مجھے سنہ ساٹھ کا راولپنڈی ایک بالکل مختلف حوالے سے یاد ہے۔

میں جب وہاں گیا، مسجدیں کم اور چھوٹی چھوٹی تھیں، دوسروں کی عبادت گاہوں کو ہاتھ لگانے کا تصور بھی نہ تھا۔ رمضان کے دنوں میں ہوٹل بند نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کے دروازے پر ایک پردہ ڈال دیا جاتا تھا۔ مری میں علاقے کی بہترین بیئر بنتی تھی اور گرمیوں کے دنوں میں راولپنڈی کے قریب قریب ہر بڑے اسٹور پر بینر آویزاں ہوتا تھا جس پر لکھا ہوتا تھا ''یہاں ٹھنڈی بیئر ملتی ہے۔''

یہ سب تھا مگر معاشرہ نیک تھا، پاکباز تھا، راست گو تھا اور ساتھ ساتھ عبادت گزار بھی تھا۔

کیسے اچھے دن تھے۔ کیسے اوجھل ہو گئے دیکھتے دیکھتے۔

اس کے ساتھ جو بہت بڑی نعمت اوجھل ہوئی وہ دکھ سکھ میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ نبھانے والے دوست، رفیق اور عزیز تھے۔

راولپنڈی کا ایک بہت بڑا حسن یہ تھا کہ یہ شہر نہ بہت چھوٹا تھا نہ بہت بڑا۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ یہی نہیں، سب ایک دوسرے کے ہمدم بھی تھے۔ کچھ روز ہوئے میں نے سنہ ساٹھ کے راولپنڈی کے اپنے دوستوں، ہم پیشہ لوگوں اور سینئر صحافیوں کی فہرست بنائی۔ چار

پانچ کے سوا سب مر چکے ہیں۔ پھر وہی میر تقی میر کا مصرعہ یاد آتا ہے ۔

خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

جب تک اسلام آباد نہیں بنا تھا یا بن رہا تھا، دارالحکومت کو راولپنڈی میں عارضی ٹھکانہ دے دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اکثر کہنہ مشق صحافی راولپنڈی آ گئے۔ ان کے سائے میں نوآموز صحافیوں کی ایک پوری نسل پروان چڑھی۔ آج میں ان سب کو یاد کر کے ان کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کر رہا ہوں۔

شبیر حسین شاہ: ہم نوآموز صحافیوں کے بزرگ بھی تھے اور یار بھی تھے۔ ایسی باغ و بہار شخصیتیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ساری دنیا انہیں شاہ صاحب کہتی تھی۔ ضلع گجرات کے گاؤں مدینہ کے رہنے والے تھے مگر ہمیشہ انگریزی صحافت سے تعلق رہا۔ بہت عمدہ انگریزی لکھتے اور بولتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب فخر ماتری اپنے اخبار کی تیاری کے سلسلے میں راولپنڈی آئے اور فلیش مین ہوٹل کے وی آئی پی سوٹ میں ٹھہرے، شاہ صاحب نے ان کے ساتھ بہت وقت گزارا۔ ماتری صاحب کا معمول تھا کہ وہ تقریر کے انداز میں بولتے اور دوسرے سنا کرتے لیکن شاہ صاحب کا معاملہ کچھ یوں تھا کہ وہ بولتے، انگریزی میں بولتے اور انسان اور دنیا کا فلسفہ بیان کیے جاتے اور ماتری صاحب منہ کھولے ان کی باتیں سنا کرتے اور بار بار کہتے کہ آپ یہ ساری باتیں لکھتے کیوں نہیں۔ انہیں اپنے سوال کا جواب نہیں ملا۔

جب راولپنڈی کے لیاقت باغ میں پریس کلب قائم ہوا جہاں دو چار کے سوا شہر کے ساری صحافی آیا کرتے تھے، شاہ صاحب بیٹھک لگا کر بیٹھتے اور ان کے گرد مجمع لگا رہتا۔ مجمعے میں اکثر نوجوان ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب ان سے ہنسی مذاق کیا کرتے اور قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے ہلتے ہوئے دانتوں کو سنبھالا کرتے۔ شاہ صاحب کی رنگت سیاہی مائل تھی۔ لوگ ان سے کہا کرتے تھے کہ سیّد کبھی کالے نہیں ہوتے۔ بعض من چلے انہیں پنجاب کی ایک بستی کے نام پر کالا شاہ کاکو کہا کرتے۔ بعض کا اس بات پر اصرار تھا کہ وہ سیّد ہوتے ہوئے سُنّی کیسے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک پنجابی کہاوت سننے میں آتی:

لکڑ دی کُنّی نئیں

سیّد ہے تو سُنّی نئیں

پہلے حصے کا مطلب ہے کہ لکڑی کی ہنڈیا نہیں ہو سکتی۔ باقی خود قیاس کر لیجیے۔

شاہ صاحب کا تعلق روزنامہ پاکستان ٹائمز سے تھا۔ جہاں تک میری ان پر نگاہ رہی، وہ اخبار میں اپنی ڈائری لکھا کرتے تھے۔ پتا نہیں اپنی اس ڈائری میں وہ انسان اور دنیا کا فلسفہ بیان کرتے تھے یا نہیں۔

شاہ صاحب نے بڑی عمر پائی۔ ضعیفی کے باوجود لکھنے لکھانے سے باز نہیں آئے۔ دنیا سے پروانۂ راہداری بھی اپنے ہاتھ سے لکھا ہوگا، مجھے یقین ہے۔

صفدر قریشی: بہت سینئر تھے۔ اتنے کہ ہمیں کبھی ان کا قرب نصیب نہیں ہوا۔ اکثر بزرگوں کی طرح سب سے ذرا فاصلہ رکھا مگر جب بھی ملتے تھے بہت خندہ پیشانی کے ساتھ۔ سرکاری خبر رساں ادارے اے پی پی سے تعلق تھا اور نہایت معتبر اور مستند صحافی سمجھے جاتے تھے۔ حکومت کی اعلیٰ سطح تک ان کی رسائی تھی اور سیاست کے معاملات کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا، پرکھا اور جانا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا وہ بھی چل بسے۔

احمد حسن: خبر رساں ادارے پی پی آئی کے سینئر صحافی تھے۔ زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتے تھے مگر ملنے جلنے کے معاملے میں گرم جوشی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مجھے یاد ہے، کسی چھٹی کے روز اپنے بال بچوں کے ساتھ راولپنڈی سے ذرا باہر اُس پارک کی سیر کو گئے جسے پہلے کبھی ٹوپی رکھ یا ٹوپی پارک اور بعد میں ایوب پارک کہا جانے لگا تھا۔ وہاں سے آ کر احمد حسن صاحب نے پی پی آئی کے لیے فیچر نما خبر لکھی جو غالباً چھ حصوں میں جاری ہوئی۔ یہ ان کے مشاہدے کا کمال تھا۔ نہایت نیک انسان تھے اور ان بلاؤں سے بہت پرے تھے جنہیں کتنے ہی اخبار نویس اپنی شان سمجھتے تھے۔

ابصار رضوی: احمد حسن مرحوم کے ساتھی تھے۔ خوش شکل، خوش وضع، ذہین اور ملنسار تھے۔ بہت اچھے اور ذمے دار صحافی تھے۔ اپنا زیادہ وقت اپنے دوستوں کے حلقے میں گزارتے تھے جن میں روزنامہ لیڈر کراچی کے اصحاب نقوی سرفہرست تھے۔ ابصار رضوی پریس کلب کم ہی آتے تھے۔ راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس سے بھی ذرا فاصلہ رکھتے تھے۔ بعد میں وہ خود اور اصحاب نقوی اسلام آباد میں بس گئے اور جب میں آخری بار ان دونوں سے ملا، ان کی صحتیں جواب دے رہی تھیں۔ خوشحالی کے ساتھ آنے والی وبائیں بالآخر دونوں کو سمیٹ کر لے گئیں۔

سعید اختر: راولپنڈی کے نہایت اسمارٹ صحافی تھے۔ جیسی خوشگوار شخصیت تھی ویسی ہی خوشگوار ان کی باتیں تھیں۔ یو پی پی نام کے خبر رساں ادارے میں کام کرتے تھے جس کا دفتر

صدر ہی میں تھا مگر جس کی خبریں فرسودہ ٹائپ رائٹر پر کاربن کاپی کی شکل میں ان کا ملازم لایا کرتا تھا، اس کی لکھائی اتنی مدھم ہوتی تھی کہ اخبار میں ان کی کسی خبر کے شائع ہونے کی نوبت کبھی کبھار ہی آیا کرتی تھی۔ (ایسا ہی ایک ادارہ اسٹار کے نام سے ہوا کرتا تھا جس کی خبریں سائیکلو اسٹائل سے نکلتی تھیں)

سعید اختر اور ان کے کچھ ساتھیوں نے راولپنڈی سے شام کا ایک اخبار بھی نکالا جو چل نہ سکا۔ اسی کی شہ سرخی میں لفظ ''پیش رفت'' میں نے پہلی بار پڑھا تھا جو مجھے اچھا لگا تھا اور اسی وقت اپنے ذخیرۂ الفاظ میں شامل کر لیا تھا۔

سعید اختر کے دوستوں کا حلقہ بڑا تھا۔ تیز و طرار لوگوں کو وہ کھڑپینچ کہا کرتے تھے۔ ہمارے حبیب الرحمان (جنگی) سے ان کا بہت یارانہ تھا جو آخر عمر تک رہا۔ اس وقت سعید اختر واہ کینٹ میں اور حبیب لندن میں آباد تھے۔ واہ کینٹ کے ذکر پر یاد آیا کہ اسلحہ ساز ادارے پی او ایف کے تعلقات عامہ کے راز مراد آبادی سے بھی سعید اختر کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ راز مراد آبادی کی شاعری اور گالم گلوچ کو بہت شہرت حاصل تھی۔

سعید اختر قسم کھانے کو نہیں بلکہ قسم کھائے ہوئے انقلابی رہ چکے تھے۔ سرخ سویرے کا انتظار کرنے والے بہت سے نوجوانوں کی طرح انہوں نے بھی قلعہ لاہور کے عقوبت خانے میں وقت گزارا ہے۔ یاد آتے ہیں تو ذہن میں ان کی نہایت خوشگوار تصویر بنتی ہے۔

سنہ 2009ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ اسی جگہ جسے دیکھ کر شہنشاہ اکبر نے کہا تھا: واہ۔

ثمر جالندھری: راولپنڈی میں ایسے چاہنے والے میرے کم ہی دوست تھے۔ ثمر کی کھلی کھلی رنگت، نیلی نیلی سی آنکھیں اور بارعب قد و قامت مجھے آج تک یاد ہیں مگر اس شخص سے میرا ساتھ چند مہینے رہا اور وہ چل بسا۔ میں ثمر کو آخری کندھا دینے والوں میں شامل تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ اکرام الحق سے بھی میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔ وہ خیر سے زندہ سلامت ہیں اور روزنامہ نوائے وقت میں برسوں کی شدید محنت کے بعد ستّر برس سے بھی زیادہ عمر میں ریٹائر ہوئے ہیں۔

ثمر جالندھری نے راولپنڈی میں صحافت کا پیشہ اُس وقت اختیار کیا جب شہر میں صحافیوں کی قلت تھی اور ملک کے اکثر بڑے اخبار لاہور سے شائع ہوتے تھے۔ ثمر شہر راولپنڈی

میں روزنامہ نوائے وقت لاہور کے پہلے نامہ نگار تھے۔ بعد میں جب یہ اخبار پنڈی سے نکلا تو اس کے چیف رپورٹر مقرر ہوئے۔ اس سے پہلے وہ لاہور کے اخباروں احسان، آفاق اور زمیندار کو بھی خبریں بھیجا کرتے تھے۔ آخر یہی ہوا کہ اس شخص نے محنت کر کر کے خود کو ختم کرایا۔

ثمر نوجوانی میں شعر کہتے تھے۔ مشاعرے پڑھنے دور دور تک جایا کرتے تھے اور اس زمانے میں ایک ادبی جریدے گرداب کے ایڈیٹر اور مالک بھی تھے۔ ان کے گھر پر ادبی نشستیں ہوتی تھیں اور شعر وادب پر مباحثے اور مذاکرے ہوتے تھے۔

ثمر جالندھری نے راولپنڈی کے اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح شہر کے گورڈن کالج میں تعلیم پائی تھی۔ چنانچہ نہ صرف یہ شعر وادب بلکہ علم بھی ان کی شخصیت سے صاف جھلکتا تھا۔ اخبار نوائے وقت والوں نے ان کا بہت خیال رکھا اور انتقال کے بعد ان کے بیٹے یوسف ثمر کو کمسنی کے باوجود ملازمت دے دی۔ وہ بچہ بھی باپ کی طرح دن رات محنت کرتے کرتے چل بسا۔ خود ثمر نے بھی عمر کے چالیس برس مکمل نہیں کیے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو بہت یاد رکھے جاتے ہیں۔

ہدایت اختر: ہم جیسے معمولی صحافی نہیں بلکہ کہنہ مشق، تجربہ کار اور اس پیشے میں اعلیٰ مقام رکھنے والے سینئر ایڈیٹر تھے۔ ہم دونوں کی جب دوستی ہوئی، وہ روزنامہ نوائے وقت کے راولپنڈی ایڈیشن کے ایڈیٹر تھے۔ اس سے پہلے وہ اخبار کے لاہور ایڈیشن سے منسلک تھے۔

ہم بہت بے تکلف تھے۔ جب کبھی دل گھبراتا، میں ان کے پاس چلا جاتا۔ کبھی کبھی کہتے "یار عابدی، یہ دو چار خبریں ترجمہ کر دو۔" ان کی ٹانگ میں ذرا سا لنگ تھا مگر ہم دونوں دیر تک پیدل چلا کرتے تھے۔

بعد میں جب میں روزنامہ حریت سے وابستہ ہو کر کراچی چلا گیا اور 1965ء کی پاک بھارت جنگ کی خبریں بھیجنے دوبارہ راولپنڈی گیا تو ہدایت اختر نے میرا بہت ساتھ دیا۔ میں خبروں کی تلاش میں ان کے دفتر چلا جاتا اور ساری سہولتوں کو کام میں لاتا۔ اسی دوران پاکستانی فوج والے صحافیوں کی ایک بڑی جماعت کو جموں کے بھارتی علاقے چھمب جوڑیاں کا محاذ دکھانے لے گئے۔ اس دل دہلانے والے سفر میں ہدایت اختر میرے ساتھ تھے۔ چھمب کے گاؤں میں دکانداراپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہاں تک کہ انگیٹھیوں پر چائے کا پانی پکتے پکتے خشک ہو چکا تھا۔ ہدایت اختر نے ویسی ہی ایک دکان میں کھڑے ہو کر میرے کیمرے میں

اپنی تصویر اتروائی تھی اور پھر وہ تصویر اپنے دفتر میں لگا لی تھی۔ یوں بھی یہ علاقہ اُن کی آبائی سرزمین جموں کا تھا۔

بعد میں کسی وقت ان کے انتقال کی خبر آئی۔ پتا چلا کہ نوائے وقت کے ایڈیٹر مجید نظامی سے ان کا اختلاف ہوا اور تلخ کلامی کے نتیجے میں ہدایت اختر گھر بیٹھ رہے اور اس سے پہلے کہ لوگ بیچ بچاؤ کراتے، وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کا تو سارا گھرانا آفتاب تھا۔ ہدایت اختر کے بیٹے ڈاکٹر مجاہد کامران پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ اس فخر میں تھوڑا سا حصہ دار میں بھی ہوں۔

فاروق اعظم: میرے پیارے دوست تھے مگر یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ مجھے پیارے زیادہ تھے یا میرے دوست زیادہ تھے۔ ہم دونوں کے دل ملتے تھے اور مل کر خوشی ہوتی تھی۔ فاروق اعظم سرگرم صحافی تھے اور اخبار نویسی میں ذمے داری کا احساس ان پر غالب تھا۔ فاروق اعظم کے پاس چھوٹا سا اسکوٹر تھا اور ان کا گھر مری روڈ ہی پر تھا جہاں ہم ان کی بیٹھک میں اکثر بیٹھا کرتے تھے کہ گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔

فاروق اعظم ذرا اوزنی تھے۔ عمر بھی آگے کو نکلی جا رہی تھی۔ میں کہتا تھا کہ شادی کر لو مگر وہ کہتے تھے کہ ابھی میں تیار نہیں، میرا خیال ہے ان سے یہ بات سبھی کہتے تھے۔ میں کراچی چلا گیا تو ایک دن اخبار میں خبر پڑھی جس کی سرخی کچھ یوں تھی: فاروق اعظم کی بھی شادی ہو گئی۔

پھر جب بھی میرا راولپنڈی جانا ہوا۔ یہی پتا چلا کہ ان کے ہاں بچہ نہیں ہوا۔ کافی عرصے بعد میری ملاقات ہوئی اور پھر وہی بچے کی بات نکلی۔ کہنے لگے کہ دعا کیجیے کیونکہ وقت نکلا جا رہا ہے۔

اور پھر یہی ہوا...... وقت نکل گیا۔

اشرف ہاشمی: پتا نہیں یہ گھر کی تربیت ہے یا کیا ہے کہ میں اپنے دوستوں کو آپ کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔ بہت کم دوست ایسے ہیں جنہیں میں تم کہتا ہوں۔ ایک اشرف ہاشمی ایسا تھا جس سے تو تکار اور گالم گلوچ میں بھی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ میں کہا کرتا تھا کہ کہنے کو ہاشمی ہو، دراصل بالکل بھنگی ہو۔ اس کے جواب میں وہ مجھے موٹی سی گالی دیتا تھا اور جواباً میں بھی اس کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔

اشرف ہاشمی چلتا پرزہ تھا۔ خدا جانے کہاں کہاں تک اس کی رسائی تھی۔ اس نے اتنے

وسائل جمع کر لیے تھے کہ اسلام آباد میں اپنا مکان بنا لیا تھا جبکہ یہ کام رشوت خور سویلین اور غیر سویلین حکام ہی سرانجام دیے جا رہے تھے۔ اشرف ہاشمی نے خدا جانے کیسے شمالی کوریا والوں سے رسم وراہ بڑھالی اور ان کا تعلقات عامہ کا کام کرنے لگا۔ میرے اخبار حریت کے لیے رپورٹنگ کرنے لگا۔ ٹیلی فون پر دن بھر کی خبریں لکھوا دیتا تھا۔ پارلیمان سے لے کر ایوان صدر تک ہر جگہ اس کی رسائی تھی۔

آخر میں اس نے ایک اور کارنامہ انجام دیا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ یعنی حکومت کے انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹر ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راولپنڈی اور اسلام آباد سے انگریزی کے کئی اچھے اخبار نکل رہے تھے اور پاکستان ٹائمز پر برا وقت پڑا تھا۔ مجھے یقین نہیں کہ اشرف ہاشمی اپنے اخبار کو اونچا اٹھا سکا۔ حالانکہ زندہ ہوتا تو دو چار گالیاں دے کر ثابت کرتا کہ اس کے زمانے میں پاکستان ٹائمز آسمان کو چھو رہا تھا۔

پاکستان ٹائمز کا تو خدا جانے کیا حشر ہوا لیکن اشرف ہاشمی یقیناً آسمان کو چھو رہا ہے۔

احمد حسن علوی اور حبیب الرحمان: ان دو نوعمر صحافیوں کی دوستی مثالی تھی۔ حبیب الرحمان تو نوخیز تھا اور چہرے بشرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ آگے چل کر وہ اچھا صحافی بنتا۔ میرے زمانے میں اسے پشاور 'بھیج' دیا گیا تھا جہاں وہ چل بسا۔ احمد حسن علوی کامیاب صحافی ثابت ہوئے۔ ترقی کرتے کرتے روزنامہ ڈان کے اسلام آباد بیورو سے منسلک ہو گئے مگر وہ بھی اپنے دوست کی طرح زیادہ نہیں جیے۔

شیخ اکرام الحق: اس نسل کے صحافیوں میں جو ایک بحمد للہ سلامت اور ابھی تک توانا ہیں، وہ نوائے وقت راولپنڈی کے بے حد پرانے صحافی اکرام الحق ہیں۔ سترّ سے اوپر ہو گئے اور اخبار میں کام کرتے رہے تو بال بچوں اور اخبار کے مالکان نے انہیں مجبور کیا کہ اب گھر بیٹھیں۔

اکرام ہمارے مرحوم دوست ثمر جالندھری کے چھوٹے بھائی ہیں اور ماشاء اللہ اپنے کنبے کے ساتھ اسلام آباد میں خود اپنی گاڑھی کمائی سے بنائے ہوئے مکان میں آباد ہیں۔ اسلام آباد میں ایسے مکان بس دو چار ہی ہیں۔

مجھے میرے زمانے کے اخبار نویسوں کے بارے میں تازہ اطلاعات انہوں نے ہی فراہم کیں۔ اللہ میاں انہیں صحت کے ساتھ جیتا رکھے۔

اقبال (آزاد کشمیر): راولپنڈی میں آزاد کشمیر کے دفتر اطلاعات اور مطبوعات کے مقامی نگران اقبال صاحب اور مظفر آباد میں ان کے افسر اعلیٰ مسٹر پنڈت تھے۔ اقبال صاحب جیسا نرم گفتار اور غمگسار کون ہوگا۔ بہت اچھے دوست تھے۔ بڑے پیار سے اپنے کام نکلواتے تھے۔ مجھے کئی بار آزاد کشمیر کے پہاڑوں کی سیر کرائی۔ انہیں میری اس کمزوری کا خوب خوب علم تھا۔ ایسے نیک لوگ بھی بالآخر مر جاتے ہیں۔ افسوس۔

کہنہ مشق صحافی: سنہ ساٹھ کے عشرے میں فضل قریشی، اسرار احمد، صفدر قریشی اور احمد حسن (پی پی آئی) جیسے تجربہ کار صحافی راولپنڈی میں آباد ہو چکے تھے۔ اسرار احمد کا ذرا بھاری بھرکم وجود اور صفدر قریشی کے ماتھے پر زخم جیسا نشان آج بھی یاد آتا ہے۔ احمد حسن کا ذکر پہلے ہو چکا، فضل قریشی خیر سے زندہ ہیں اور اپنے ادارے پی پی آئی کی ترقی یافتہ شکل سے وابستہ ہیں۔ نوجوانی میں میری اور غازی صلاح الدین کی ان سے خوشگوار دوستی تھی اور ہم ان کی شادی میں بھی شریک ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے کراچی میں ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ پرانی باتیں انہیں کم ہی یاد ہیں۔

سینئر صحافیوں میں فاروق عثمانی، بشیر الاسلام عثمانی اور اے پی پی کے نقشبندی بھی تھے جو سنا ہے، بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ فاروق اور بشیر الاسلام صاحبان نے فنا کی راہ لے لی۔

ہمارے ایک اور سرگرم صحافی ناصر بخاری تھے مگر ایک الگ سی مخلوق تھے۔ ہمیشہ کُرتا اور شلوار پہنا جس کا باقاعدگی سے دھویا جانا ضروری نہیں تھا۔ ایک بار ان کے ایڈیٹر مجید نظامی صاحب نے بخاری صاحب سے کہا کہ آپ کے پاس کوئی پتلون قمیص نہیں ہے، جواب ملا۔ جی ہے۔ پوچھا گیا: مگر کہاں ہے؟ جواب ملا ہے: جی گھر پر۔ لوگ انہیں تمبا پوش کہتے تھے۔ پتا نہیں اس کا کیا مطلب ہے۔

خبر رساں ادارے اے پی پی میں ہمارے دوست تھے: عالم اور اشرف۔ کام میں بہت مددگار اور غیر معمولی تعاون کرتے تھے۔ عالم باقاعدگی سے پریس کلب آتے تھے اور اچھی ٹیبل ٹینس کھیلتے تھے۔ سنا ہے اب بھی کہیں سرگرم ہیں۔ اشرف کی خبر نہیں۔

ایک اور سرگرم صحافی انوار فیروز تھے۔ خیر سے اب بھی ہیں۔ ان سے کچھ زیادہ قرب نہیں رہا لیکن باذوق تھے۔ بعد میں شعر کہنے لگے لیکن یہ شغل ان کے کنبے کا بھی تھا۔ ان کی دو بیٹیاں شاعر ہیں اور شعر کو سمجھنے والے کہتے ہیں کہ اپنے والد سے بہتر شعر کہتی ہیں۔ جھوٹ کہنے والے کی گردن پر......

آخر میں تین ایسے حضرات کا ذکر جو صحافی نہیں تھے لیکن صحافیوں سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ ایک تو راولپنڈی شہر کے حکیم صاحب تھے جو ہر سال جاڑے شروع ہوتے ہی معجون کی شیشیاں لے کر اخباروں کے دفتروں میں پہنچ جاتے تھے اور یہ شیشیاں بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر جب ہماری کراچی کے صحافیوں اور کاتبوں کی ٹولی نئی نئی راولپنڈی پہنچی تھی اور نومبر کے جاڑے تھے، حکیم صاحب معجون سے بھرا ہوا تھیلا لے کر پہنچ گئے اور اپنی دانست میں خود کو گرم رکھنے کا سامان دے گئے۔ پرانے بازار میں ان کا مطب اور برابر میں کیمسٹ کی دکان بھی اُن ہی کی تھی۔ آزمودہ انگریزی دواؤں کی ٹکیوں پر یونانی دواؤں کا ملمع چڑھا کر مریضوں کو دیا کرتے تھے۔

دوسرے ظفر اکبر آبادی تھے اور خیر سے ہیں۔ ان کا تعلق پہلے پہل روزنامہ پاکستان ٹائمز اور بعد میں ڈان کے انتظامی امور سے تھا مگر صحافی برادری میں یوں گھل مل جاتے تھے کہ ان پر اخبار نویس ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

ریڈیو پاکستان سے بھی کچھ تعلق تھا۔ میری ان سے ٹیلی فون پر بات ہوتی تو ہمیشہ کہا کرتے تھے: ''بھائی آپ کی آواز تو ریڈیو والی ہے۔ اخبار چھوڑیئے، براڈ کاسٹنگ اختیار کیجیے۔'' مجھے مانتے ہی بنی۔

ہمارا اور پاکستان ٹائمز کی انتظامیہ کا دفتر دونوں قریب قریب تھے اور رات دیر تک کھلنے والی سگریٹ اور پان کی دکان دونوں کے درمیان تھی۔ ایک رات میں سگریٹ خریدنے گیا تو پاکستان ٹائمز کا چپڑاسی پان خرید رہا تھا۔ اس کی پان طلب کرنے کی ادا شاعرانہ تھی۔ ''دو پان لگا دو۔ ایک تمباکو مراد آبادی، دوسرا ظفر اکبر آبادی۔''

اس پر یاد آیا کہ اچھے شاعر ہیں۔ دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اپنے نعتیہ کلام پر سیرت ایوارڈ پا چکے ہیں۔ اسلام آباد میں بھاری خسارہ اٹھانے کے بعد کراچی اپنے بچوں کے قریب چلے گئے ہیں۔ میرا رابطہ ہوا تو بتایا کہ دل کی شریانوں میں دو سٹنٹ ڈلوا چکے ہیں۔ اپنا یہ شعر بھی سنایا۔

ظفر نہ ہوش کسی کا نہ کچھ خبر اپنی　　کہاں پہ چھوڑ دیا لا کے حیرتوں نے مجھے

تیسرا، میرا نہایت وفا شعار ملازم جس کا نام ویر محمد رہا ہوگا جو بگڑ کر بیر محمد ہو گیا۔ سنہ ساٹھ میں جب راولپنڈی پریس کلب قائم ہوا اور میں اس کی انتظامیہ میں شامل تھا تب وہاں ایک کینٹین کھولنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے لیے ایک کارکن کی ضرورت تھی۔ خدا جانے کون کہاں

سے بیر محمد کو بھرتی کر لایا جو سابق فوجی تھا اور حیرت انگیز خندہ پیشانی کا مالک تھا۔ اس کے آتے ہی چائے بنانے اور پلانے کے سارے لوازمات خریدے گئے اور بیر محمد کینٹین چلانے لگا۔

اب مشکل یہ تھی کہ جیسا کہ ہوتا آیا ہے کہ کینٹین کے اکثر گاہک (یعنی اخبار نویس) تھوڑے سے مفلسی کی طرف مائل تھے۔ وہ بیر محمد سے ادھار مانگتے۔ چار چار آنے پر جھگڑا کرتے یا پھر پیسے دیے بغیر چپکے سے سرک جاتے۔ بیر محمد ایک ایک کے پیچھے دوڑتا لیکن کبھی کسی کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہیں آتا۔ یوں کام چلتا رہا اور لوگ بیر محمد کی شرافت سے فائدہ بھی اٹھاتے رہے اور اس کی خندہ پیشانی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے سراہتے بھی رہے۔ میں نے بھی اس پر کبھی سختی نہیں کی اور اس کا معاملہ اسی پر چھوڑ دیا۔

غضب اُس وقت ہوا جب صحافیوں کے ساتھ لگے لگے جواری بھی اپنی شامیں پریس کلب میں گزارنے لگے۔ غل غپاڑہ کرنے کے علاوہ وہ سب اپنے تھیلوں میں چھپا کر شراب کی بوتلیں بھی لانے لگے اور بیر محمد پر ساقی کے فرائض عائد کرنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مرحلے پر میں راولپنڈی اور اس کا پریس کلب چھوڑ کر کراچی چلا گیا لیکن بیر محمد نے آخر عمر تک یہ فرض نبھایا۔

مجھے یاد ہے ایک روز ہم دوستوں کی ٹولی پریس کلب سے نکلی اور کالج روڈ کی طرف پیدل چلی۔ دیکھا کہ سامنے سے بیر محمد اپنی سائیکل پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی سائیکل سے اتر کر پیدل چلنے لگے کیونکہ ہم سے زیادہ بلندی پر چلنا شاید ان کی فوجی تربیت اور آداب کے خلاف تھا۔

مجھے وہ شخص بہت عزیز تھا۔ سنا ہے چل بسا۔ کلب والوں کو بھی وہ عزیز رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کی جگہ اس کے بیٹے ریاض کو ملازم رکھ لیا گیا جو سنا ہے کلب کا سارا نظام چلاتا ہے۔

کیوں نہ چلائے، بیر محمد کا بیٹا جو ہوا۔

راولپنڈی میں ڈھائی تین سال کے قیام کے دوران میں نے ڈھائی تین غلطیاں بھی کیں۔ ایک رات کوئی ایسی خبر نہیں آ رہی تھی جسے شہ سرخی بنایا جائے۔ ان دنوں جو چھکڑے جیسے ٹیلی پرنٹر چلا کرتے تھے، ان میں کبھی کوئی بڑی خبر آ جائے جسے فلیش کہا جاتا تھا تو زور زور کی گھنٹی بھی بجا کرتی تھی۔ تو ہوا یہ کہ جب میں سر پکڑے بیٹھا تھا، وہی گھنٹی بجی۔ میں دوڑا ہوا گیا اور وہ فلیش پڑھا۔ خبر یہ تھی کہ امریکہ نے صحرائے نواوا میں زیر زمین ایٹمی دھماکہ کیا ہے۔ میں نے اپنے اخبار کی پیشانی پر اس کی شہ سرخی جما دی۔ اگلی صبح جب تمام بڑے اخبار آئے تو ان کے جمگھٹ میں

میری لگائی ہوئی سرخی میری حماقت کا بڑے جلی حروف میں اعلان کر رہی تھی۔

ایک رات یہ ہوا کہ صدر میں ہمارے دفتر کے سامنے والی تین منزلہ عمارت میں ایک صاحب شراب پی کر اور پستول اٹھائے آ گئے اور لگتا تھا کہ کسی کو مار کر ہی دم لیں گے۔ میں نے اخبار کو پریس میں جانے سے روک دیا۔ ایس ایم رضوی عمارت میں چلے گئے تاکہ قتل ہوتے ہی ہمیں اطلاع کریں۔ ادھر چھاپے خانے والے اخبار کا مطالبہ کرنے لگے کیونکہ اخبار چھپ کر دور دور تک جانا تھا۔ ہم نے انہیں صورتحال بتائی تو قتل کا نظارہ کرنے وہ سب بھی دفتر میں آ گئے۔ ادھر اس شرابی کو کسی نے دو جوتے مارے اور وہ کمبخت ہوش میں آ گیا۔ اس صبح اخبار تاخیر سے چھپا اور اس میں نقصان بھی ہوا ہوگا۔

دو مرتبہ مجھے رپورٹنگ کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ ایک مرتبہ ایبٹ آباد کے قریب حویلیاں کے آخری اسٹیشن کو جانے والی ٹرین پل پر سے اتر کر برساتی نالے میں جا گری اور کئی مسافر مر گئے۔ اس واقعے کی رپورٹنگ کے لیے میں فوٹو گرافر کو لے کر وہاں پہنچا۔ تمام لاشیں قریبی اسپتال کے مردہ خانے پہنچا دی گئی تھیں۔ مردہ خانہ کیا تھا، اینٹوں کے فرش کا ایک کمرہ تھا جہاں لاشیں فرش پر ڈال دی گئی تھیں جن کے قریب برف کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ مجھ سے وہ منظر نہیں دیکھا گیا۔ میں لپک کر باہر آ گیا اور ایک کان کو ہاتھ لگایا۔

دوسری بار میں کورٹ رپورٹنگ کرنے چلا۔ مجسٹریٹ کی عدالت میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی اور اس گھر کے معمولی سے ملازم کو پیش کیا گیا۔ ملازم پر الزام تھا کہ وہ لڑکی کو ورغلا رہا ہے۔ اسے عدالت کی تحویل میں لے کر لڑکی کو بچایا جائے۔ مجسٹریٹ نے لڑکی سے کہا کہ تم اس لڑکے سے بچ کر رہو۔ یہ تمہاری عزت خاک میں ملا دے گا۔ لڑکی نے مجسٹریٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "جناب وہ سب تو ہو چکا ہے، آپ ہمارا نکاح پڑھوا دیجیے۔"

میں لپک کر باہر آ گیا اور دوسرے کان کو ہاتھ لگایا۔

غرض یہ کہ صحافت کی راہ میں پہلا اہم قدم تھا جو مجھے یوں راس آیا کہ تمنا کے سارے قدم طے ہوتے گئے اور میں نہ کہیں ٹھہرا، نہ رُکا۔ پتا نہیں قسمت یا تقدیر ہے بھی یا نہیں مگر کچھ تھا ضرور اور کوئی تھا ضرور جو پھر میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلا۔

اور چلتا گیا۔

---------O---------

اردو صحافت کا تاج محل

میں نے جب راولپنڈی کو خیر باد کہہ کر اور کراچی پہنچ کر روز نامہ حریت کے دفتر میں قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ پورا دربار آراستہ ہے۔ رونق، چہل پہل، مشورے، ملاقاتیں، منصوبے، ارادے، فیصلے اور پھر بدلتے ہوئے فیصلے، ہدایتیں، نصیحتیں اور یہ بھی اس شان سے کہ ابھی اخبار نکلنے میں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ باقی ہے۔

ایسی تیاریوں سے شاید ہی کبھی کوئی اخبار نکلا ہو۔

ان تیاریوں کی سب سے بڑی خوبی اخبار کے مالک اور مدیر اعلیٰ فخر ماتری کا عزم، ان کے ارادے اور ان کا حوصلہ تھا جو بہت بلند تھا۔ انہوں نے خواب دیکھا تھا اور اس خواب کی تعبیر کو اپنے ہاتھوں تکمیل تک پہنچا رہے تھے۔

درجنوں افراد پر مشتمل عملہ مقرر ہو چکا تھا، وعدوں پر نہیں نقد کی صورت میں ماہانہ اجرت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص فخر ماتری کی تعبیر سچ کر دکھانے کی دھن میں مگن غیر معمولی لگن سے کام کر رہا تھا۔ جو لوگ بھرتی کیے گئے تھے وہ اِدھر اُدھر سے نہیں اٹھا لیے گئے تھے، ہر ایک اپنی کسی نہ کسی خوبی کی بنا پر شریک کیا گیا تھا۔ کسی نہ کسی ہنر میں نام کمایا تھا۔ کسی نے کوئی کمال کر دکھایا تھا۔ وہ سب بلا لیے گئے۔ لالچ دے کر نہیں، اچھی اجرت کا وعدہ کر کے اور پھر وہ وعدہ پورا کر کے۔

پھر پورا ادارہ حرکت میں آ گیا۔ کام شروع ہو گیا اور اخبار نکلنے میں پورا ایک مہینہ باقی تھا۔ یہ صحیح معنوں میں کمر کسنے کا مہینہ تھا۔ اجرا کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ دمکتے ہوئے چہرے اور درخشاں ہو رہے تھے۔ جاگتی آنکھیں روشن خواب دیکھ رہی تھیں اور کوئی رکاوٹ، کوئی دشواری اور

کوئی پریشانی ان خوابوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پا رہی تھی۔

اردو صحافت کا تاج محل اب تعمیر ہونے کو تھا۔

فخر ماتری حریت سے پہلے تین اخباروں کے بانی تھے۔ دو اخبار وطن اور ملت گجراتی زبان میں تھے اور گجراتی ماتری صاحب کی مادری زبان تھی۔ ان اخباروں کے اداریئے وہ خود لکھتے تھے جن کی بہت دھوم تھی۔ تیسرا اخبار لیڈر شام کا انگریزی اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر سلطان احمد جیسے ذہین اور کہنہ مشق صحافی تھے۔

اردو میں حریت نکال کر ماتری صاحب اپنے مخصوص لب و لہجے اور انداز فکر کو دور دور تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اردو ان کی زبان نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے مولانا حسن مثنیٰ ندوی جیسے عالم کو اپنے ساتھ ملایا۔ ماتری صاحب اداریے کا نفس مضمون انہیں لکھواتے تھے۔ مولانا پھر اسے سنوار کر اخبار میں شامل کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے، مئی سنہ 64ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر ماتری صاحب نے چتا کے انگارے کے عنوان سے ایک طویل اداریہ لکھا جس کے اقتباس غیر ملکی اخباروں نے بھی شائع کیے۔ اسی طرح جب اسلامی ملک انڈونیشیا نے اپنی فضائی کمپنی کا نام ہوا کے ہندو دیوتا گروڑا کے نام پر رکھا تو ماتری صاحب کا مخصوص جوشِ خطابت ان کے اداریے میں ڈھل گیا اور انڈونیشی سفارت خانے کو اس کا ترجمہ کر کے اپنے ملک بھجوانا پڑا۔

خبروں کے شعبے کی نگرانی کے لیے ماتری صاحب روزنامہ جنگ سے یوسف صدیقی جیسے نام ور نیوز ایڈیٹر کو لے آئے۔ انہوں نے حریت کا نیوز روم آراستہ کیا اور اس کا عملہ مقرر کیا جس میں ماتری صاحب نے انہیں مکمل آزادی دی۔ یہ وہ وقت تھا جب یوسف صدیقی کا جھکاؤ جماعت اسلامی کی طرف ہوا۔ انہوں نے خالد اسحٰق مرحوم کو اعلیٰ منصب دیا جن کی جماعت کے ساتھ وابستگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ انہوں نے جو عملہ مقرر کیا، مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ سارا کا سارا کسی مذہبی تنظیم یا جماعت سے جڑا ہوا نہیں تھا۔ ان میں صلاح الدین صاحب بھی تھے جو بعد میں تکبیر نامی جریدے کے مدیر اعلیٰ بنے اور سیاسی اختلاف کا نشانہ بن کر اپنی جان سے بھی گئے۔ اس عملے میں خالد علیگ بھی تھے اور طاہر احمر بھی تھے جن کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ عملے میں قیصر حسنی بھی شامل تھے جو پرانی وضع کے تجربہ کار صحافی تھے اور اپنی کسی بات سے جماعت اسلامی کے طرف دار نہیں لگتے تھے۔

میرا اور نیّر علوی کا معاملہ جدا تھا۔ ہم دونوں اپنے نظریات کے معاملے میں لبرل تھے۔ نیّر کہا کرتے تھے کہ میں پیشہ ور صحافی ہوں، جو پالیسی میرے اخبار کی ہوگی وہی پالیسی میری ہوگی۔

ماتری صاحب میں ایک بڑی خوبی تھی۔ انہوں نے اپنے اخبار میں نوجوانوں کی فوج کھڑی کی تھی۔ بعض ان میں نوآموز تھے۔ بعض یونیورسٹی سے صحافت کی تربیت لے کر آئے تھے جو عملی صحافت کے لیے کارگر ہرگز نہ تھی۔ چنانچہ ان نوجوانوں میں نثار زبیری، متین الرحمان مرتضیٰ، طاہر احمر، افسر آذر، نعیم آروی، ثناء اللہ، شریف کمال عثمانی، طاہر نصیر، حسن عسکری فاطمی، خواجہ رضی حیدر، آفتاب سیّد اور کتنے ہی تازہ مگر جی لگا کر کام کرنے اور اس سے بھی زیادہ کام سیکھنے کے معاملے میں مستعد تھے۔

ماتری صاحب نے طنزیہ کالم لکھنے کے لیے نصراللہ خاں جیسی لطیف اور خوشگوار شخصیت کو چنا۔ اسی طرح اسلامی اکابرین کی زندگی کے واقعات لکھنے کے لیے محمود فاروقی کا انتخاب کیا جن کے مضامین بہت مقبول ہوئے۔

اخبار کے صفحوں کو آراستہ کرنے کے لیے انہوں نے اے آر ممتاز کی خدمات حاصل کرلیں جو ان ہی دنوں ایک خوش وضع اور سجا دھجا رسالہ نکال کر شہرت پا چکے تھے۔ ادھر لاہور کے ہفت روزہ لیل و نہار میں زیدی کارٹونسٹ نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی، چنانچہ وہ بھی بلا لیے گئے۔

کراچی کے اخباروں میں حالات حاضرہ سے تعلق رکھنے والا قطعہ شائع کرنا ضروری تھا۔ اس کے لیے جعفر منصور کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہ عمدہ قطعے لکھتے لکھتے ایک ہوائی حادثے میں لقمۂ اجل بنے اور اس سوگوار فضا کے باوجود روزانہ ایک قطعہ لکھنے کا فرض صہبا اختر مرحوم کو سونپا گیا۔

کھیلوں کے شعبے کی ذمہ داری اسلامیہ کالج کے لطیف احمد خاں کے حوالے ہوئی اور ادب، ادیب، شعر و سخن اور نثر و نظم کے شعبے کے لیے اس وقت شہر میں عبدالرؤف عروج سے بڑا درویش صفت شخص کوئی نہ تھا۔ وہ بھی حریت کے حلقے میں چلے آئے یا یوں کہیے کہ حریت ان کے حلقے میں شریک ہوگیا۔

مجھے اس موقع پر اپنے کچھ اور ساتھی یاد آرہے ہیں۔ ان میں احمد حمید صاحب شامل ہیں جو مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ شیخ محمد مبین اگرچہ حیدرآباد سندھ میں ہمارے نامہ نگار تھے

لیکن محسوس ہوتا تھا کہ حریت کے کراچی آفس سے منسلک ہیں۔ ہمارے فوٹوگرافروں میں دو کا نام اقبال اور تیسرے کا نام رقیب پونا والا تھا۔

نہایت سرگرم، داؤد سبحانی اگرچہ رپورٹر اور فوٹوگرافر تھے مگر انہیں قدرت نے ایک صلاحیت عطا کی تھی۔ کہیں بھی کوئی کام رک رہا یا اٹک رہا ہو، وہ کروالاتے تھے۔ میں اسے جوڑتوڑ تو نہیں کہوں گا کیونکہ انہیں یہ خوبی ان کے ساڑھے چھ فٹ کے قد اور چوڑے چکلے سینے کی وجہ سے عطا ہوئی تھی۔ جہاں چاہتے رعب ڈال کر اور جہاں چاہتے پیار محبت سے بہلا پھسلا کر کام نکال لیتے تھے۔

نیّر علوی نے مرزا نامی ایک نوجوان کو کارٹونسٹ کے طور پر بھرتی کرادیا تھا۔ خوب رو اور خوش شکل ہونے کے باوجود اسے بس ایک ہی کام نہیں آتا تھا: کارٹون بنانا۔

اب جو اخبار نکلا، ایسی سج دھج سے نکلا کہ آئینے جیسا نظر آتا تھا۔ ہم نے پورا مہینہ لگا کر جو فیچر اور مضامین لکھے تھے، جن کی کتابت بھی ہو چکی تھی اور جو تصویریں جمع کی تھیں، جن کی طباعت کے لیے فلمیں بن چکی تھیں اور صفحوں کو سنوارنے اور آراستہ کرنے کے لیے جو بیل بوٹوں جیسے ڈیزائن ہمیں فراہم کردیئے گئے تھے، وہ سب ہر روز کے صفحوں پر پھیل کر ایسا تاثر پیش کرتے تھے گویا اخبار نہ ہو، علمیت اور مصوری کا آمیزہ ہوا۔

حریت کی دھوم مچ گئی۔ ماتری صاحب کے ملنے والے اخبار کی تعریف کرتے کرتے خوشامد کی لکیر بھی پار کر گئے۔ جاسوس خبر لانے لگے کہ روزنامہ جنگ کے مالک میر خلیل الرحمان کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔ وہ راتوں کو اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں اور یہ کہ سینے میں درد کی شکایت کر رہے ہیں۔

ایسے مخبروں کا ہمارے معاشرے میں یہ حال ہے کہ ایک پتھر اٹھاؤ، اس کے نیچے سیکڑوں کلبلا رہے ہوتے ہیں۔

---------O---------

کیسی اُڑان

اخبار جاری ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ماہِ محرم آ پہنچا۔ ہم لوگ یوم عاشورہ کے خصوصی ایڈیشن کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ حریت کی زندگی کا پہلا خصوصی ایڈیشن تیار ہو رہا تھا۔ اس کے سرورق کے لیے ہم نے کربلا کی زیارت گاہوں کی تصویریں چھاپنے کے بجائے ایک نئی چیز سوچی۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ پہلے صفحے پر امام حسینؓ کا آخری خطبہ جلی حروف میں لکھا جائے۔ یہی ہوا۔ اردو کے سب سے اچھے خوش نویس نے روشن قلم سے امامؓ کے آخری الفاظ کی کتابت کی۔

کسی نے کہا کہ اس میں کچھ رنگ بھی ہونے چاہئیں۔ کسی کی تجویز تھی کہ سیاہ زمین پر سفید حروف ہوں۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ اس عبارت پر خون کے چھینٹے دیئے جائیں۔ زیدی کارٹونسٹ نے فوراً ہی ایک علیحدہ کاغذ پر چھینٹوں کا ڈیزائن تیار کیا جو خطبے کی عبارت کے اوپر خون کے رنگ سے چھاپا گیا تو اخبار کا سرورق چمک اٹھا۔

عین اس وقت جب کراچی میں یوم عاشور کا جلوس برآمد ہو رہا تھا، اخبار فروش ہاکر حریت کا خصوصی شمارہ اٹھائے جلوس کے راستے پر پہنچ گئے۔ اس کا سرورق اتنا انوکھا اور جاذب نظر تھا کہ اخبار اس طرح فروخت ہونے لگا کہ ہاکر اپنے سارے پرچے بیچتے اور مزید پرچے لینے کے لیے حریت کے چھاپے خانے کی طرف دوڑتے۔ غرض اخبار دن بھر چھپتا رہا اور دن بھر فروخت ہوتا رہا۔ اس روز دوسرے اخباروں کے خصوصی ایڈیشن یوں ہی دھرے رہ گئے۔

یوں حریت لوگوں کی نگاہ میں آیا اور اس کا تذکرہ چھڑا۔ یہی کسی اخبار کی مقبولیت کی

علامت ہے۔ اس کی کچھ داد مجھے بھی ملی۔ ماتری صاحب شاباشی دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ خود کسی کے پاس نہیں جاتے تھے بلکہ جس سے بات کرنی ہو اسے اپنے کمرے میں بلاتے تھے۔ چاہے شاباشی دینی ہو۔ چاہے سرزنش کرنی ہو۔ (جو وہ کم ہی کرتے تھے۔)

اکثر دنوں کی طرح ماتری صاحب کے کمرے میں ان کے دوستوں کی محفل آراستہ تھی۔ ان میں ذوالفقار علی بخاری سب سے نمایاں تھے۔ اسی دوران ان کے چپڑاسی نے میرے پاس آ کر کہا کہ آپ کو ماتری صاحب بلا رہے ہیں۔ میں گیا تو بالکل انگلستان کی عدالت کا منظر تھا جہاں ایک جج کے علاوہ جیوری کے ارکان بھی صف بندی کر کے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ماتری صاحب نے اپنی مخصوص گرج دار آواز میں کہا ''عابدی! دیکھو بخاری صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔'' بخاری صاحب نے ذرا بھی توقف نہیں کیا اور بولے ''میاں صاحبزادے۔ یہ لفظ تن ومند آپ نے لکھا ہے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں۔'' بولے ''یہ اس طرح الگ الگ نہیں لکھا جاتا۔ اسے ہمیشہ ملا کر تنومند لکھنا چاہیے۔ سمجھے؟'' میں نے کہا ''جی سمجھ گیا۔'' میں واپس جانے لگا تو بولے ''اور سنو! تم شیعہ ہو؟'' میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا ''جی ہاں۔'' بولے ''میں دیکھتا ہوں، تم کبھی سیاہ جوتے نہیں پہنتے۔''

میں بخاری صاحب کے مشاہدے پر اور اپنی کم علمی پر حیران رہ گیا۔ جوتے کی رنگت کا مسلک اور عقیدے سے کیا تعلق ہے۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔

بڑھاپا لوگوں کے طرح طرح کے حلیے بنا دیتا ہے۔ اس نے بخاری صاحب کو شاندار بنا دیا تھا۔ ان کے بال اتنے سفید نہ ہوتے، سفید بھنویں بے تحاشا نہ بڑھی ہوتیں اور چہرے پر اتنی جھریاں نہ ہوتیں تو وہ ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتے۔

بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ کبھی نوجوان انہیں گھیر لیتے تو ان کی حاضر جوابی سے خوب لطف اندوز ہوتے۔

ایک بار بخاری صاحب لندن سے واپس آئے۔ لڑکے انہیں گھیرے بیٹھے تھے۔ ان سے پوچھا کہ بخاری صاحب! آپ نے برطانیہ اور پاکستان میں سب سے بڑا فرق کیا پایا؟ بولے: برطانیہ میں میز کی دراز کھولو تو کھلتی چلی آتی ہے۔

اس زمانے میں سچ تو یہ ہے کہ میزوں کی لکڑی اکڑ جاتی تھی اور درازیں کھولنے کے

لیے ان کے ساتھ اچھی خاصی کھینچا تانی کرنی پڑتی تھی۔ (میرے اندر کا لکھنؤ کہہ رہا ہے۔ لکھو: کھینچا تانی کرنا پڑتی تھی۔)

ماتری صاحب کا عملے کے افراد کا اپنے کمرے میں طلب کرنے کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس صبح وہ عمارت کی تیسری نہیں بلکہ دوسری منزل پر اپنے کمرے میں بیٹھے تھے جہاں سے ان کے انگریزی روزنامے لیڈر کا پورا دفتر نظر آتا تھا۔ سامنے دفتر میں ہمارے دوست اصغر، اصحاب نقوی اور غازی صلاح الدین خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ غازی کو میں سنہ 53ء سے جانتا ہوں۔ وہ کسی وقت چین سے نہیں بیٹھتے۔ کبھی اٹھ رہے ہیں۔ کبھی بیٹھ رہے ہیں اور کبھی پہلو بدل رہے ہیں۔

ماتری صاحب بہت دیر سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آخر چپڑاسی کو بھیج کر غازی کو بلایا۔ غازی سامنے جا کر کھڑے ہوئے تو ماتری صاحب وہی تھیٹر کے مکالمے کے انداز میں بولے ''غازی! تمہاری یہ بے چینی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔'' کبھی اس طرح کے برجستہ فقرے ادا کرتے تو ساتھ بیٹھے دوسرے لوگوں کو داد طلب نگاہ سے ضرور دیکھا کرتے۔

میرے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ ماتری صاحب کو خبر ملی۔ مجھے بلایا اور بولے: ''زندگی کا سب سے بڑا تفریح ٹیکس مبارک ہو۔''

خود ماتری صاحب کے گھرانے میں رخسانہ پیدا ہو چکی تھی۔

ان کی ایک خوبی اور بھی تھی۔ جس طرح ہر ایک کو اپنے کمرے میں بلاتے تھے، اس طرح ہر ایک سر اٹھائے ان کے کمرے میں داخل ہو جانے کے معاملے میں آزاد تھا۔ ایک بار حریت کے پرانے صحافی قیصر حسنی کا کسی ساتھی سے اختلاف ہوا اور مقدمہ ماتری صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ تماشا دیکھنے میں بھی پہنچ گیا۔ مولانا حسن مثنیٰ ندوی روز کے معمول کے مطابق وہیں بیٹھے تھے۔ اردو کا کوئی مشکل لفظ کان میں پڑے تو ماتری صاحب مولانا سے اس کا مطلب پوچھ لیا کرتے تھے۔ قیصر حسنی جوشیلی تقریر کر رہے تھے، کسی بات پر بولے: ''بر چشمِ قلندر'' ماتری صاحب فوراً مولانا کی طرف مڑے: کیا مطلب؟ مولانا بولے'' کچھ خاص نہیں۔''

ایک بار اور میرا ان کے کمرے میں جانا یاد رہے گا۔ میرا بہت خیال رکھتے تھے اور میں اکثر اپنی فرمائشیں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس روز معلوم ہوا کہ پی آئی اے کی افتتاحی پرواز قاہرہ جانے والی ہے جس میں بہت سے صحافی بھی جائیں گے اور حریت کو اپنا ایک آدمی بھیجنے

کی دعوت دی گئی ہے۔

مجھے دنیا دیکھنے کا غیر معمولی اشتیاق تھا۔ میں جھٹ ماتری صاحب کے پاس پہنچا اور کہا کہ مجھے قاہرہ جانا ہے۔ ماتری صاحب نے انکار نہیں کیا لیکن مجھے صاف لگا کہ مجھ سے پہلے کوئی اور ان سے یہی فرمائش کر چکا ہے اور وہ ہاں کہہ چکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور معلوم ہو گیا کہ ماتری صاحب جعفر منصور (خدا کرے مجھے صحیح نام یاد ہو) کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کر چکے ہیں۔ جعفر منصور شاعر بھی تھے اور حریت میں روزانہ قطعہ لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے راتوں رات تیاری مکمل کی۔ 20 مئی 1965ء کی صبح وہ ہوائی اڈے گئے اور دن ابھی ڈھلا بھی نہ تھا کہ خبر آئی: پی آئی اے کا طیارہ قاہرہ کے ہوائی اڈے پر اترتے ہوئے گر کر تباہ ہو گیا ہے اور چار پانچ افراد کے سوا سارے کے سارے مسافر اور موی گل جیسی دلکش ایئر ہوسٹس سمیت تمام عملہ ہلاک ہو گیا ہے۔ پورے ادارے پر سوگ کی فضا طاری ہو گئی۔ ماتری صاحب نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ کہتے بھی کیا۔

مجھے چار مہینے بعد موت کے منہ میں جانا تھا۔

---------O---------

گردن پر موت کی گرم گرم سانسیں

کشمیر کے اس علاقے میں جو بھارت کے زیر انتظام ہے، گڑبڑ شروع ہوگئی تھی۔ ایوب خاں کے جرنیل سادہ لباس میں فوجی بھیج کر وہاں توڑ پھوڑ کی کارروائیاں کرا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کشمیر کی مقامی آبادی ان مداخلت کاروں سے مل جائے گی اور اس طرح وادیٔ جنت نظیر کو بھارتی تسلط سے نجات مل جائے گی۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور جرنیلوں نے پسپائی قبول نہیں کی۔ وہ کچھ اور کرنے کی ٹھانے ہوئے تھے۔ لوگ طرح طرح کی کہانیاں سنا کر ثابت کر رہے تھے کہ بعض جرنیل اپنے عقیدے کی وجہ سے سرینگر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی کشمیر کی جنگ بندی لائن اور کشمیر سے ملے ہوئے پاکستانی علاقے میں دونوں طرف سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ اس دوران ایک بڑا واقعہ ہوا۔ ہندوستانی توپ خانے نے پاکستان کے ضلع گجرات کے گاؤں اعوان شریف پر گولے پھینکے۔ شہری آبادی پر گولہ باری کرنا جنگ کے آداب کے خلاف ہے لیکن انہوں نے خلاف ورزی کی۔ گاؤں کے نو دس افراد مارے گئے۔ اس خبر سے پاکستان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

ماتری صاحب نے حسب معمول چپڑاسی بھیج کر مجھے بلایا۔ ''عابدی! تم فوراً اعوان شریف جاؤ اور وہاں سے خبریں بھیجو۔''

دیکھتے دیکھتے پی آئی اے کا ٹکٹ آ گیا۔ میں نے اپنا تھیلا کاندھے پر ڈالا اور شام سے پہلے پہلے راولپنڈی کے ہوائی اڈے پر اتر گیا جو ان دنوں چکلالہ کہلاتا تھا۔ وہاں سے بس پکڑی اور

گجرات جا پہنچا جہاں اخبار جنگ کے زمانے کے واقف کاروں سے ملا اور صبح تڑکے اعوان شریف جانے والی بس پکڑنے کے انتظامات ہو گئے۔ ایسے اجنبی علاقے میں جہاں کے رسم و رواج الگ اور جہاں کی بولی جدا ہے، میرے اکیلے جانے سے کچھ دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ گجرات کے ایک نوجوان وکیل اصغر علی گھرال نے میرے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ ان کا آبائی گاؤں گھرال وہیں اعوان شریف کے قریب تھا۔

ہم دونوں نے صبح کی بس پکڑی اور ہری کھیتیوں، آب پاشی کی نالیوں اور رہٹ کی آوازوں کے درمیان چلتی ہوئی ہماری بس کی کھڑکیوں کے راستے جو شفاف ہوا سینے میں اتری تو روں شاداب ہو گئی۔

میں اور اصغر علی جس وقت اعوان شریف میں اترے، دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا اور ہم دونوں کو بھوک لگی تھی۔ ادھر گاؤں پر سوگ کی فضا طاری تھی۔ عورتوں کی ٹولیاں گریہ وزاری کرتی اور بین کرتی ہوئی ایک دوسرے کے گھر جا رہی تھیں اور یہ ان کا اظہار تعزیت کا ڈھنگ تھا۔ گاؤں کے باہر آٹھ دس تازہ قبریں بنی ہوئی تھیں جن پر کثرت سے پانی چھڑکا گیا تھا۔

وہیں، گاؤں کے باہر، ایک بہت بڑے درخت کی چھاؤں میں چارپائی ڈالے اس پر ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ ہم دونوں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے ہمارے آنے کا سبب پوچھا۔ اصغر علی نے ان ہی کی زبان میں سبب بتایا۔ انہوں نے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے روٹی کھا لو۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی بڑی بی کو آواز دی اور انہیں ضروری ہدایتیں کیں۔ خاتون نے پہلے سے گندھے آٹے کے دو پیڑوں کی روٹیاں تیار کیں، پہلے سے گرم تندور کا ڈھکن اٹھایا اور لمحہ بھر میں دو گلابی گلابی سی روٹیاں نکال کر مٹی کے ایک بڑے سے مٹکے میں ہاتھ ڈالا جس میں سے اچار نکال کر ان روٹیوں پر رکھا اور وہ روٹیاں ہمارے ہاتھوں میں تھما دیں۔

اتنا لذیذ کھانا میں نے زندگی میں آج تک نہیں کھایا۔

ہم دیر تک گاؤں میں گھومتے رہے۔ لوگوں کو پتا چلا کہ اخبار والے آئے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور اپنی کہانیاں سنانے لگے۔ تب پتا چلا کہ پاکستان کی فوج نے اپنا گولے بارود کا ذخیرہ گاؤں کے مکانوں میں چھپا رکھا تھا۔ یہ بات جنگ کے آداب کے خلاف ہے، لہٰذا بھارت والوں نے بھی جنگ کے آداب کی خلاف ورزی کی اور گاؤں پر اس امید میں گولے پھینکے کہ ایک شرارہ بھی گولہ بارود میں گیا تو پورا کشمیر لرز اٹھے گا۔ اتفاق سے ذخیرہ بچ گیا مگر

گاؤں کے بے قصور باشندے نہ بچ سکے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جو مقامی باشندے ہمارے جلوس میں شامل ہو گئے تھے، ان میں کئی ایسے غیر فوجی بھی تھے جنہیں فوج نے تربیت دے کر بھارتی کشمیر میں بھیجا تھا۔ وہ بھی اپنے قصے سناتے رہے اور بتاتے رہے کہ پل کیسے تباہ کیے جاتے ہیں اور سڑکیں کیسے۔ انہوں نے ان مقامات کے نام بتائے جہاں بھارتی فوج نے اعوان شریف کی طرح گولہ باری کی تھی۔

غرض مجھے رپورٹنگ کے لیے اتنا مواد مل گیا کہ ایک پورا اخبار بھرا جا سکتا تھا۔ اب ہمیں اپنی خبریں بھیجنے کے لیے راولپنڈی پہنچنا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور اب کوئی بس آنے یا جانے کا امکان نہیں تھا۔ اصغر علی نے تجویز پیش کی کہ کھیتوں کے اندر سے چلتے ہوئے ان کے گاؤں گھرال چلیں اور رات وہیں گزار کر صبح کی پہلی بس سے گجرات پہنچیں۔

وہ پیدل سفر، ہاں وہ پیدل سفر کھیتوں کے بیچ نہیں، بہشت کے بیچ تھا۔ دن ڈھل رہا تھا، کسان اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ فضا بالکل خاموش تھی اور کافی فاصلے پر چلتے ہوئے کسان ایک دوسرے سے یوں باتیں کرتے جا رہے تھے جیسے ان کے درمیان دوری ہی نہیں، جیسے وہ شانہ سے شانہ ملا کے چل رہے ہوں۔ اسی آہستگی سے سوال کیا جاتا تھا، اتنی ہی آہستگی سے جواب آتا تھا اور وہ بھی اس شان سے کہ جواب کا ایک ایک لفظ سمجھ میں آتا تھا۔

وہ رات جو میں نے گاؤں کے آنگن کے بیچ پڑی ہوئی چارپائی پر آسمان کو دیکھتے ہوئے گزاری، اس رات کو میں بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھلا پاؤں گا۔

اس رات میں اگر محبت میں مبتلا ہوتا اور تارے گننے کی نوبت آ جاتی تو میں گریبان پھاڑ کر چیختا چلاتا کھڑی فصلوں میں کود پڑتا۔ اس رات آسمان کے ہر سیارے، ہر سورج اور ہر ستارے نے قسم کھالی تھی کہ وہ کراچی سے آئے ہوئے شہری بابو کو اپنا جلوہ دکھا کر رہے گا۔ ستاروں کو شمار کرنا تو رہا ایک طرف، تاروں کے بیچ بیچ خالی جگہوں کو گننے کی سوچی تو کوئی تھاہ نہ ملی۔ بس اتنا ہوش تھا کہ کچھ دیر بعد صبح کی اذان ہوگئی۔

ہم نے قاہرہ کی اذانوں کا بہت ذکر سنا ہے۔ اگر کسی کو اذان سننے کا ایسا ہی اشتیاق ہو تو وہ ہمارے گاؤں دیہات میں فجر کی اذان سنے اور اللہ پر از سرِ نو ایمان لے آئے۔

ابھی حریت کی رپورٹ کی دھوم مچی ہی تھی کہ پاکستان کی فوج نے، جسے آزاد کشمیر کی فوج کا نام دیا گیا تھا، سرحد پار کر کے جموں کے اس علاقے میں داخل ہو کر پیش قدمی شروع کر دی

جو ضلع گجرات سے یوں ملا ہوا تھا کہ پتا ہی نہ چلتا تھا کہ کہاں پاکستان ختم ہوتا ہے اور کس جگہ کشمیر شروع ہوتا ہے۔ (یکم ستمبر 1965ء)

جنگ چھڑ گئی۔ میں راولپنڈی ہی میں تھا جہاں حریت کا کوئی نامہ نگار نہیں تھا لیکن اخبار مقبول ہو رہا تھا۔ ماتری صاحب کی ہدایت آئی کہ میں وہیں ٹھہروں اور جنگ کی خبریں بھیجوں۔ میرا جس فلیٹ میں قیام تھا، میں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ ایک الماری میں کچھ کھانے پینے کے سامان کا ذخیرہ کیا اور خبروں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

وہاں معمول یہ تھا کہ پریس انفریمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ہر شام نامہ نگاروں کو جنگ کا احوال بتایا جاتا تھا۔ انہیں سوالات پوچھنے کی دعوت دی جاتی تھی اور محاذ سے آئی ہوئی تصویریں فراہم کی جاتی تھیں۔ روزنامہ جنگ نے اس دوران ہر جگہ پہنچ جانے والے دیوقامت نامہ نگار داؤد سبحانی کو راولپنڈی بھیج دیا۔

پہلے ہی روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ شام کی بریفنگ میں نامہ نگاروں کو بھارت کے ایک فوجی افسر کی ڈائری کا عکس فراہم کیا گیا۔ حکام کا دعویٰ تھا کہ افسر اپنا یہ ذاتی روزنامہ اپنے مورچے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ بریفنگ ختم ہوئی۔ میں نے تصویروں اور خبروں کا ایک پیکٹ بنایا اور ہوائی اڈے کی طرف دوڑا۔ ان دنوں جنگ کی وجہ سے راولپنڈی سے کراچی کے لیے پی آئی اے کی صرف ایک پرواز جاتی تھی، وہ بھی دن کے اجالے میں۔

ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں نے اس کے عملے سے کہا کہ اس میں بہت ضروری تصویریں اور رپورٹیں ہیں، براہ کرم کراچی لے جائیے۔ وہ جھٹ تیار ہو گئے۔ دو گھنٹے کے اندر پیکٹ کراچی پہنچ گیا۔ جہاں ہمارے سرگرم رپورٹر ثناء اللہ نے اسے وصول کیا اور صبح صبح ہمارا واحد اخبار تھا جس نے بھارتی فوجی افسر کے روزنامچے کا عکس چھاپا۔ ماتری صاحب نے سرشار ہو کر بڑا اداریہ لکھا کہ حریت کو یہ ڈائری چھاپنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ (اسی کے بعد داؤد سبحانی راولپنڈی کی جانب دوڑائے گئے۔) اس وقت ریڈیو فوٹو یا تار کی طرح تصویر بھیجنے کی سہولت دستیاب نہیں تھی۔ سارا اخباری مواد پی آئی اے کے ذریعے آتا جاتا تھا۔

پاکستانی فوج جموں کے علاقے میں آگے بڑھتی گئی۔ اس نے وہ دریا پار کیا جو چھوٹا توی کہلاتا ہے، پھر چھمب نامی گاؤں پر قبضہ کیا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر اس نے جوڑیاں پر قبضہ کر لیا جو فوج کا بڑا ٹھکانہ تھا اور اب اس کے قدم بڑے توی اور اکھنور کی جانب بڑھ رہے تھے۔

یہاں پہنچ کر پاکستان کی فوج جموں کو سرینگر سے ملانے والی سڑک کاٹ سکتی تھی۔ اس طرح وادیٔ کشمیر باقی بھارت سے کٹ سکتی تھی۔ یہ فوج کی بہت بڑی اور تاریخی کامیابی ہوتی۔

جس صبح یہ کارنامہ سرانجام دیا جانا تھا، ایک شام پہلے نامہ نگاروں کو یہ نوید سنائی گئی کہ کل صبح آپ کو جوڑیاں کے محاذ پر چلنا ہے۔ ہم نے اپنے کیمرے وغیرہ تیار کیے۔ جن کے پاس خاکی لباس تھا، وہ انہوں نے پہن لیا تاکہ ہوائی حملے کی صورت میں دشمن کو نظر نہ آئیں۔ اس طرح صبح صبح پچیس تیس اخباری رپورٹروں کو لے کر فوجی جیپیں محاذ کی طرف روانہ ہوئیں۔

راہ میں وہی گاؤں دیہات ملنے لگے جو اعوان شریف کی طرف جاتے ہوئے ملے تھے۔ ایک جگہ ہم نے راہ بدلی اور اس علاقے میں داخل ہو گئے جو اصولاً جموں کا بھارتی علاقہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد توپوں کی اکادکا گھن گرج سنائی دینے لگی۔ سارا علاقہ خالی خالی سا نظر آ رہا تھا۔ تمام آبادی حملے کے آثار دیکھ کر فرار ہو گئی تھی۔ پھر بھی ایک شخص کو دیکھا جو چارپائی سر پر اٹھائے جموں کی طرف پیدل جا رہا تھا۔ نامہ نگاروں کا یہ قافلہ اور آگے چلا کہ اچانک بھارت کے جیٹ حملہ آور ہوئے۔ چونکہ ہماری گاڑیاں سڑک پر چل رہی تھیں، اس لیے انہیں نشانہ بنانا آسان تھا۔

جوں ہی طیاروں نے فائرنگ شروع کی، گاڑیاں رکیں اور ہر شخص نے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کیا جس کے جہاں سینگ سمائے وہ سہم کر وہیں پڑ رہا۔ اتفاق سے مجھے اور میرے کچھ ساتھیوں کو ایک خندق مل گئی۔ ہم نے اس میں پناہ لی اور حال یہ تھا کہ سر اٹھا کر صورتحال دیکھنے کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔

مجھے اپنی گردن پر موت کی گرم گرم سانسیں لگتی محسوس ہوئیں۔

طیارے واپس چلے گئے تو سب اپنی کمیں گاہوں سے برآمد ہوئے۔ زیادہ تر صحافی حضرات گھبرا کر آب پاشی کے ایک نالے میں کود گئے۔ وہ جو نکل کر آئے تو دیکھا کہ سب کیچڑ میں لت پت تھے۔

ڈرائیوروں نے اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں اور ہمارا قافلہ آگے چلا۔ چھوٹا توی با آسانی پار کر لیا حالانکہ اس پر کوئی پل بھی نہیں تھا۔

اب ہم اس گاؤں کے بازار میں داخل ہوئے جس کا نام چھمب تھا اور جس کا ذکر خبروں میں مسلسل آ رہا تھا۔ گاؤں میں دو چار ہی دکانیں اور چائے خانے تھے جو سارے کے سارے کھلے ہوئے تھے لیکن ان میں نہ کوئی دکاندار تھا نہ کوئی گاہک۔ ایک جگہ تو انگیٹھی پر چائے کی

کیتلی چڑھی ہوئی تھی جس کا پانی بھاپ بن کر اڑ چکا تھا۔ وہاں ہم ذرا دیر کو رکے اور تصویریں اتاریں۔ ہمارے بے حد اچھے دوست ہدایت اختر نے ایک دکان میں کھڑے ہو کر اپنی تصویر اتروائی جس کا میں نے بعد میں بڑا پرنٹ بنوا کر انہیں پیش کیا۔

یہاں ایک مزے کا واقعہ ہوا۔

ہماری جیپ کے ڈرائیور نے کپڑے کی ایک دکان سے نکلتے ہوئے ایک تھان کا کونا پکڑا اور اسے پکڑتے پکڑتے واپس آ کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے تھان کا باقی کپڑا یوں کھینچا جیسے بڑھی ہوئی پتنگ کی ڈور کھینچی جاتی ہے۔ وہ ڈور تو خیر چرخی پر لپٹ جاتی ہے، یہاں چرخی جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ ڈرائیور تھان کھینچتا گیا اور اپنی ٹانگوں کے درمیان فرش پر ڈھیر کرتا گیا۔

اس وقت ہمیں محسوس ہوا کہ میدان جنگ میں فاتح فوج کی ذہنی کیفیت کیسی ہو جاتی ہے۔ غریب بزاز کا ریشمی تھان ہو یا غریب کسان کی جوان بیٹی۔ دونوں کے ساتھ پتنگ کی ڈور والا سلوک ہوتا ہے۔

ہم آگے چلے، جوڑیاں اور اکھنور کی جانب۔ تھوڑے فاصلے پر ہم ایک ٹیلے پر چڑھے جہاں فوج کی کمان قائم تھی۔ وہاں علاقے کا ایک نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم نے پہلی بار فوجی نقشہ دیکھا۔ اس میں ایک ایک عمارت، یہاں تک کہ ایک ایک درخت تک نظر آ رہا تھا۔ فوجی کمان والوں نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ اگلے محاذ کی کیا صورتحال ہے۔

یہ بتایا ہمیں ایک یورپین نامہ نگار نے جو اگلے محاذ کی طرف سے پیدل چلا آ رہا تھا۔ وہاں ہم ایک سفید فام رپورٹر کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جسے ہم نے کسی بریفنگ میں نہیں دیکھا تھا اور جو ہم سے بھی پہلے اگلے محاذ کے معائنے کے لیے لے جایا گیا تھا۔

اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں بی بی سی کا جان آس مین ہوں۔ ہندوستان نے لاہور کے محاذ پر حملہ کر دیا ہے اور یہاں سے پاکستانی فوج واپس جا رہی ہے۔''

عین اسی وقت بھارت کے لڑاکا طیاروں نے دوسرا حملہ کیا۔ اس علاقے میں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہم ان میں چھپ گئے اور اپنے جینے کی دعا مانگنے لگے لیکن بی بی سی کا جان Osman ایک خشک نالی میں لیٹ گیا اور اپنا ٹیپ ریکارڈر چلا کر اپنی رپورٹ ریکارڈ کرنے لگا جس میں طیاروں کی فائرنگ کی آوازیں بھی ساتھ ساتھ بھری ہوں گی۔ ہمارا قافلہ وہیں سے واپس لوٹا اور تیزی سے پاکستان کی سرزمین کی طرف چلا۔ جان آس مین نے ہم سے لفٹ بھی

نہیں مانگی۔اسے گھومنے پھرنے کی آزادی حاصل تھی۔

تیزی سے چلتے ہوئے ہم گجرات کے علاقے میں پہنچ گئے اور ریڈیو پر تازہ خبریں سننے کی کوشش کرتے رہے۔تازہ اطلاعات راولپنڈی پہنچ کر ملیں۔

اُس دور کے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر نے اپنی کتاب میں کمان کی اچانک تبدیلی، فوجی افسروں کے درمیان اختلافات اور ایوب خان اور ان کے فوجی سربراہ جنرل موسیٰ پر طاری کیفیت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

ہمیں اس وقت یہ اطلاع مل رہی تھی کہ صدر ایوب خان پر دہشت طاری ہے اور یہ کہ ان کے مشیر انہیں پورے وقت یہ یقین دلاتے رہے تھے کہ ساری کارروائی کشمیر کے متنازعہ علاقے میں ہو رہی ہے، بھارت بین الاقوامی سرحد پر محاذ کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

وہ اس نے کی۔

لاہور کے دفاع کے خیال سے جو بی آر بی نہر تعمیر کی گئی تھی، اس پر حملے کے وقت پاکستان کے صرف اور صرف دس فوجی تعینات تھے۔دشمن کی فوج آگے بڑھتے بڑھتے لاہور کے شالامار باغ کی چاردیواری تک پہنچ گئی اور حیران ہو رہی تھی کہ اس کا راستہ کیوں نہیں روکا جا رہا ہے۔

اس دوران داؤد سبحانی خاموشی سے سرک گیا اور پنجاب کے محاذ پر جا پہنچا۔

---------O---------

آگے سمندر ہے

اخباروں کو دو چیزیں زندہ رکھتی ہیں: بھاری سرمایہ اور بڑے واقعات۔ (آپ چاہیں تو اسے برے واقعات پڑھ لیں۔)

بڑے واقعات ہی کسی اخبار کی بڑی آزمائش ہوتے ہیں جس نے بھی ان واقعات کے ایک ایک پہلو کا استحصال کیا، وہ پڑھنے والوں کی نگاہ میں معتبر اور مقبول ٹھہرا۔

روزنامہ حریت نے اس راہ میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ خصوصاً سنہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے موقع پر پڑھنے والوں کے جذبات کے تار چھیڑ کر اخبار نے اچھا راگ الاپا۔

مثال کے طور پر جنگ کے دوران ایک روز ایک پنجابی نغمے نے بڑی دھوم مچائی۔ اس کے بول کچھ یوں تھے ''جنگ کھیڈ نئیں ہندی زنانیاں دی'' ماتری صاحب نے جھٹ اپنے آدمی دوڑائے: ''اس شاعر کو ڈھونڈ کر لاؤ۔''

شاعر لایا گیا۔ کچھ جعفر طاہر جیسا نام تھا۔ اس کے نغمے کی جی کھول کر تعریف کی گئی۔ نغمہ جلی حروف میں کتابت کرایا گیا۔ اخبار کے صفحوں میں اس شان سے آراستہ کیا گیا جیسے عموماً شادی کے سہرے چھاپے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر سے کہا گیا کہ روز ایک نغمہ لکھو۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے لکھنے والے بھی زورِ قلم صرف کرنے لگے۔ ہر طرف سے خبریں آنے لگیں، بہت کم آنکھوں دیکھی۔ اکثر کانوں سنی۔ حریت کا ایک خصوصی ایڈیشن تیار کیا گیا جس کا سرورق پاکستان کے بہت بڑے اور گراں مصور جمیل نقش سے بنوایا گیا جس کا خیال اقبال کے مصرعے سے لیا گیا۔

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

خود ماتری صاحب نے ایسے ایسے اداریئے لکھے کہ زورِ خطابت اُن پر ختم تھا۔ میں نے اپنے راولپنڈی کے قیام کا ذرا ذرا سا حال لکھا۔

غرض یہ کہ اخبار نے بڑا نام پایا۔

اس سے چار مہینے پہلے قاہرہ میں پی آئی اے کا طیارہ گر کر تباہ ہوا تھا۔ حریت نے اس کے سلسلے میں بھی خبر رسانی کے جوہر دکھائے۔ ہمارے رپورٹر ثناء اللہ نے جو مراسم بنا لیے تھے، انہوں نے حادثے سے متعلق ہزار طرح کی معلومات فراہم کیں۔ میں نے اخبار کے صفحات کی تزئین و آرائش کے فرائض سنبھالے اور ہر روز حادثے کی خبروں کو طرح طرح سے پیش کیا۔ بیسیوں پاکستانی مارے گئے۔ اخبار نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ یہی اخبار کی نیک نامی کا سبب بنتا ہے۔

سنہ 65ء کے آغاز میں ایک اور بڑا واقعہ ہوا اور اس میں تو اخبار نے اپنی کشتیاں جلا دیں۔ صدر ایوب نے ملک کے دونوں بازوؤں میں بنیادی جمہوریت کا نظام قائم کرنے کے بعد صدارتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار انتخابی کالج قائم کیا گیا یعنی ووٹ کا حق عوام کو نہیں بلکہ ان کے منتخب کیے ہوئے بنیادی جمہوریت کے ارکان کو دیا گیا۔

یہاں تک تو غنیمت تھا۔ اس دوران خلاف توقع ایک اور بڑا واقعہ رونما ہوا۔ حزبِ اختلاف نے قائداعظم کی ہمشیرہ فاطمہ جناح کو الیکشن لڑنے پر آمادہ کر لیا۔ انہیں معاشرے میں غیر معمولی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ البتہ وہ سیاست سے پوری طرح کنارہ کش ہو گئی تھیں۔ مغربی پاکستان اور اس سے بھی بڑھ کر اس وقت کے مشرقی پاکستان میں حزبِ اختلاف نے محترمہ کی حمایت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

اب رہ گیا شہر کراچی۔ اس نے تو فاطمہ جناح کو کامیاب کرانے کی قسم کھا لی تھی۔ محترمہ کا انتخابی نشان لالٹین تھا۔ لوگوں نے اپنے گھروں پر لالٹینیں آویزاں کر لیں۔ محترمہ کے جھنڈے لہرائے گئے۔ پوسٹر لگائے گئے اور مسجدوں میں ان کی کامیابی کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔

اس سارے قصے میں ذرا سوچیے، آگے آگے کون تھا: روزنامہ حریت۔

فاطمہ جناح کی حمایت کا مطلب تھا حاکمِ وقت کی مخالفت اور حاکم بھی ایک فوجی آمر۔ ماتری صاحب مس جناح کی انتخابی مہم میں شریک ہو گئے اور نہ صرف ان کے اداریئے بلکہ

تبصروں، جائزوں اور خبروں کا جھکاؤ صاف صاف محترمہ کے حق میں نظر آنے لگا۔

ادھر الیکشن کمیشن نے نو انتخابی جلسے کرائے جن میں صدارتی امیدواروں کو اپنے ووٹروں کے سامنے اپنی بات کہنے کا موقع دیا گیا (اس الیکشن میں دو گمنام امیدوار بھی کھڑے تھے) فاطمہ جناح جن کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی، ہر جلسے میں شریک ہوتیں اور جب حاضرین سے کہا جاتا تھا کہ محترمہ سے سوالات کریں تو مجمع چلا کر کہتا کہ ہمیں محترمہ پر پورا اعتماد ہے۔ ہمیں ان سے کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔

پھر مجمع کو سمجھایا جاتا کہ یہ کوئی مقدمے کی جرح نہیں ہے۔ آپ ایسے سوال کیجیے تاکہ امیدوار کو اپنی بات کہنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے۔ اس پر لوگ سوال کرتے اور فاطمہ جناح اپنے مخصوص لب و لہجے میں جواب دیتیں۔

اس کے برعکس ایوب خاں، جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، سلجھی ہوئی اردو میں اپنی بات سمجھاتے اور درمیان میں شعر بھی پڑھتے۔ لوگ ان کے خلاف نعرے لگاتے تو ایوب خاں کہتے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

حریت کے عملہ کی پوری ٹیم کراچی کے جلسے کی روداد لکھنے گئی۔ میرے ذمے محترمہ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ لکھنے کا کام تھا جو میں نے تندہی سے انجام دیا اور ساتھ ہی زندگی کی ایک اور بڑی حماقت کی:

میں نے محترمہ کی گفتگو کو سنوارنے کی بجائے ساری بات ان ہی کے لب و لہجے میں حرف بہ حرف لکھ دی۔

کیسا بڑا خسارہ تھا وہ کسی امیدوار کے حق میں

اس کے بعد سب جانتے ہیں کہ کیا ہوا۔ ایوب خان جیت گئے۔ مشرقی پاکستان تک میں، جو کچھ عرصے بعد بغاوت کرنے والا تھا، فاطمہ جناح کامیاب نہ ہو سکیں۔

یہاں تک غنیمت تھا۔ اب ایوب خان کے کیمپ نے اہلِ کراچی کو فاطمہ جناح کی حمایت کی سزا دینے کی ٹھانی اور ایک بار یوں لگا کہ ایوب خان اور ان کے حمایتی پاکستان کے نہیں بلکہ گندھارا کے لیڈر ہیں۔

انہوں نے کراچی میں ایک جلوس نکلوایا جس نے خاص طور پر مہاجر بستیوں میں لالٹین

آویزاں کرنے والے مکانوں کے درمیان جا کر محترمہ کی ایسی بے عزتی کی کہ لوگوں سے یہ منظر دیکھے نہ گئے اور وہ اپنے گھروں میں سہم کر اور بند ہو کر بیٹھ گئے۔

گستاخی کی وہ کارروائی کچھ ایسی تھی کہ یہاں لکھی نہیں جا سکتی کہ اس تحریر کو عورتیں بھی پڑھیں گی اور بچے بھی۔ الطاف گوہر اپنی کتاب میں اس مقتل گاہ کا ذکر صاف ٹال گئے۔

مجھے وہ رات یاد ہے۔ یہ سارا واقعہ ناظم آباد میں ہمارے گھر سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر دور لالوکھیت میں ہو رہا تھا جہاں سے لوگوں کی آہ و بکا کا ایسا شور بلند ہو رہا تھا کہ دلّی میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سفاکی کی یاد تازہ ہوگئی۔ ہمارے گھرانے کی عورتوں نے کہا کہ بھارت میں تو ہندو ہمیں مار رہے تھے، ہم یہاں آ گئے۔ یہاں مسلمان ہمیں مار رہے ہیں۔ اب ہم یہاں سے کہاں جائیں گے۔

ایک بزرگ نے جواب دیا: ''گھبراؤ نہیں، آگے سمندر ہے۔''

---------O---------

صحافیوں کی پوری فصل

حرّیت زیادہ عرصے نہیں جیا۔

اس کے گزر جانے کی داستان کہنے سے پہلے دو چار باتیں اور ہیں جو رہی جا رہی ہیں اور جن کا بیان ہونا ضروری ہے۔

حرّیت نے صحافیوں کی ایک پوری فصل اور ایک پوری نسل کھڑی کی۔ اخبار کو اگر صنعت کہا جائے تو اس میں جتنے کل پرزے حرّیت نے جوڑے اس سے پہلے شاید ہی کسی اخبار نے جوڑے ہوں گے۔

اس میدان میں قدم رکھنے والوں کا حال کہتا ہوں۔

مولانا حسن مثنیٰ ندوی کا تعلق بہار کے اعلیٰ گھرانے سے تھا جس نے نہ صرف تحریکِ آزادی بلکہ تحریکِ پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ مولانا ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل تھے اور علم و دانش میں انہیں حیرت انگیز دخل تھا۔ ماتری صاحب کے بلاغت سے بھرے اداریوں کو سنوارتے تھے اور ہر روز ایک کالم ترتیب دیتے تھے جس کا عنوان ''محراب و منبر'' تھا۔ اس میں روزانہ قرآن کی ایک آیت، ایک حدیث، تاریخ کا ایک واقعہ اور بزرگوں کے اقوال اور اسی طرح کی چیزیں اکٹھا کی جاتی تھیں اور لوگ اشتیاق سے پڑھتے تھے۔

مولانا میں ایک بڑی خوبی تھی۔ وہ ہم سب کے دوست تھے۔ بزرگوں میں بیٹھتے تو بزرگوں جیسی باتیں کرتے، لڑکوں میں بیٹھتے تو ان کے اندر کا نوجوان نکل آتا تھا اور وہ ہر طرح کے لطیفے کہتے تھے۔ لڑکے کہا کرتے تھے کہ آپ نے داڑھی نہیں بڑھائی تو مزے مزے کے جواب دیا

کرتے تھے۔ انہیں کچھ سینے کی تکلیف تھی اور کسی ڈاکٹر نے انہیں کیکڑے کے گوشت کا سوپ پینے کا مشورہ دیا جو چینی طعام خانوں میں کثرت سے ملتا تھا اور ہم لوگ بڑے شوق سے پیا کرتے تھے۔ کیکڑے کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں، مولانا نے خود کوئی جواب دینے کے بجائے ہم لوگوں سے پوچھا۔ ہم نے کہ حرام تو نہیں۔ ممکن ہے مکروہ ہو اور اگر بطور دوا کام میں لایا جائے تو جائز ہے؟

مولانا اسی شام سوپ پینے چلے گئے۔

وہ بڑے بڑے عالموں سے واقف تھے۔ ندوہ میں تعلیم کے دوران انہیں بزرگوں کا قرب اور فیض حاصل رہا ہوگا۔ ایک بزرگ کے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ ان کا دمِ آخر تھا۔ مولانا عیادت کو گئے تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھالیا اور بولے ''حسن! اب معاملات سمجھ میں آنا شروع ہوئے ہیں تو بلارہا ہے۔''

ہزار خوبیاں تھیں ان میں۔ بہاری کباب تو ایسے لذیذ پکاتے تھے کہ واہ۔ عمر بھر شادی نہیں کی۔ ہم نے سبب لاکھ بار پوچھا، وہ ہر بار چپ رہے۔

ماتری صاحب لوگوں کو خدا جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر بلاتے۔ ہمارے بزرگ نصر اللہ خان پرانے اخبار نویس تھے اور غضب کا طنز و مزاح لکھتے تھے۔ کسی گوشۂ گمنامی میں تھے وہاں سے برآمد کیے گئے اور حریت میں ''آداب عرض'' کے عنوان سے کالم لکھ کر پھر سے جی اٹھے۔ پہلے ہی شمارے میں انہوں نے عملے کے تمام سرکردہ افراد کے چھوٹے چھوٹے خاکے لکھے جن کے ساتھ زیدی نے ان کے چہروں کے خاکے بھی بنائے۔ اخبار کی تیاری کے ایک ماہ کے دوران وہ ہم سب کو اتنا جان گئے تھے کہ ہمارے خاکے بے تکان لکھ کر سب ہی کو حیران کردیا۔ بے حد خوش اخلاق اور غضب کی شگفتہ شخصیت تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے وہ محفلِ کھل اٹھتی۔ ان کا بدل پھر پیدا نہ ہوا۔

یوسف صدیقی صحیح معنوں میں خبر شناس تھے۔ اخبار میں کس خبر کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، یہ فن اُن سے بہتر کسی کو نہیں آتا تھا۔ الفاظ کی نشست و برخاست کا خاص ہنر ہوتا ہے۔ اس میں انہیں مہارت تھی۔ ایک دور تھا جب شراب سے رغبت تھی اور اس کے لیے ہم جونیئر لوگوں سے بھی قرض مانگ لیتے تھے جو پھر کبھی لوٹایا نہیں۔ پھر ان کے اندر تبدیلی آئی اور دین کی طرف راغب ہوئے۔ جماعت اسلامی سے خوب خوب متاثر تھے۔

خالد اسحاق مرحوم حریت کے پہلے نیوز ایڈیٹر تھے۔ وہ سرگرم، فعال اور تجربہ کار صحافی

تھے اور انہیں یوسف صاحب ہی نے دریافت کیا تھا۔ ان کا جھکاؤ نہیں تھا بلکہ یقینی طور پر جماعت سے وابستہ تھے۔ نرم گفتار تھے۔ دوسروں کے کام میں دخل نہیں دیتے تھے۔ صرف ایک بار مجھ سے پوچھا کہ امام حسین کی ہمشیرہ جنابِ زینب کے خطبے میں فلاں لفظ آپ نے کہاں سے نقل کیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ فتح مکہ کے بعد معاف کیے جانے والوں کا ذکر کچھ لوگوں پر گراں گزرتا تھا۔
خالد اسحاق کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ ان کے پیٹ میں السر تھے جو غالباً راتوں کو جاگنے کے باعث ہوئے۔ ایک رات شدید درد کے عالم میں اسپتال لے جائے گئے جہاں وہ چل بسے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کے معدے میں اسپرین کی جو گولیاں تھیں، جو لمحہ بھر میں گھل جاتی ہیں، وہ کیمیاوی اثرات کی وجہ سے گھل نہیں پائیں۔
بہت نیک تھے، بڑی صفات کے مالک تھے۔

قیصر حسنی پرانے زمانے کے صحافیوں جیسے تھے۔ وہ ایک خاص وضع جو اگلے وقتوں کے لوگوں میں ہوتی ہے، ان میں تھی۔ غصے کے ذرا تیز اور اسی جلال کے عالم میں جب ماتری صاحب کے سامنے "برپشم قلندر" جیسا فقرہ ادا کیا تو ایک بار تو اخبار کے مالک جو بعد میں فخر صحافت کہلائے، اپنی کم علمی پر پاؤں پٹخ کر رہ گئے۔

نیّر علوی راولپنڈی سے لائے گئے تھے۔ ہونہار تھے، ذہین تھے اور خوش شکل تھے۔ خبر نگاری کو خوب سمجھتے تھے اور نوجوان تھے۔ اس لیے تیزی سے کام کرتے تھے۔ یوسف صدیقی سے بہت قریب تھے اور ان سے صحافت کی تعلیم لی تھی۔ نیّر اور میں، ہم دونوں جنگ راولپنڈی سے لائے گئے تھے اور ہمارے درمیان ایک عجیب سی چشمک تھی۔ غالباً دونوں میں آگے بڑھنے کی لگن تھی اور اس طرح ایک دوڑ سی لگی تھی۔ اگرچہ بہت عرصے راولپنڈی کے ایک ہی مکان میں اکٹھے رہے مگر درمیان فاصلہ رہا۔ نیّر نیند کے معاملے میں خوش نصیب تھے۔ رات بھر جاگ کر کام کرتے تھے اور دن بھر گہری نیند سوتے تھے۔ پھر بھی صحت ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ ہمارے جنگ پنڈی کے ساتھی رفیع الزماں زبیری کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی اور انہوں نے خوشحال زندگی گزاری۔ پھر جب حرّیت پر برا وقت پڑا تو وہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ البتہ 1997ء کے قریب لاکھانی گھرانے نے ایکسپریس کے نام سے بڑا اخبار جاری کیا تو نیّر علوی کو اس کا پہلا ایڈیٹر مقرر کیا۔ میں اُن ہی دنوں بی بی سی سے ریٹائر ہوا تھا۔ میں نے نیّر کو لکھا کہ مجھے لندن میں اپنا نامہ نگار مقرر کر دو اور میرا نام خوب خوب استعمال کرو۔

ان کا جواب نہیں آیا اور پھر یوں ہوا کہ جواب کا امکان ہی دنیا سے اٹھ گیا۔

خالد علیگ ہمارے بہت اچھے ساتھی تھے۔ مجھے خبر نہیں کہ وہ پہلے سے صحافی تھے یا نہیں۔ اندر کے صفحات پر دن بھر کام کرتے تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے لیکن کبھی ہم لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے شعر نہیں سنائے۔ ان کے بڑے بھائی حضور احمد شاہ، روزنامہ ڈان سے وابستہ تھے۔ دونوں ہی انقلابی تھے۔ خالد علیگ بہت جیے اور انتقال کے بعد لوگوں نے انہیں بہت یاد رکھا۔

اے آر ممتاز صحافی کم مصور زیادہ تھے۔ صفحات کی آرائش کا فن انہیں خوب آتا تھا اور اس کی خاطر ماتری صاحب انہیں ڈھونڈ کر لائے تھے۔ ان کا تعلق دکن سے تھا۔ خوش شکل تھے اور ایک بار انہیں کسی فلم میں اداکاری کی پیشکش بھی ہوئی تھی جو انہوں نے رد کر دی۔ زیادہ عمر نہیں پائی۔

محمود فاروقی دینی واقعات لکھا کرتے تھے۔ خدا جانے کہاں کہاں سے صحابہ کے دلچسپ واقعات ڈھونڈ کر لاتے تھے اور انہیں بڑے سلیقے سے لکھ کر ان پر ویسی ہی سرخیاں جماتے تھے۔ ان کے ایک کالم کی سرخی مجھے آج تک یاد ہے "اور اُس نے پیالہ الٹ کر رکھ دیا" کچھ عرصہ ہوا میں امریکہ گیا تو محمود فاروقی مرحوم کے بیٹے مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے اسی پیالے والی سرخی کا ذکر کیا تو انہوں نے جھٹ اس کالم کی فوٹو کاپی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ اپنے والد کے لکھے ہوئے کالموں کا انتخاب کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ پھر خدا جانے اس کتاب کا کیا بنا۔

صلاح الدین نے اپنی صحافت کا آغاز حرّیت ہی سے کیا۔ انہیں تو ایڈیٹر ہونا چاہیے تھا جو وہ آگے چل کر جلد ہی ہفت روزہ تکبیر میں ہو گئے۔ بہت اچھے تبصرے اور تجزیے کرتے تھے۔ بعض معاملات پر ہم دونوں تبادلۂ خیال کرتے تو جی میں آتی کہ اس معاملے پر اداریہ لکھیں۔ وہ تو ممکن نہ تھا۔ ہم نے "انجمن تحفظِ حقوقِ ساکنانِ کراچی" جیسے نام سے ایک خیالی تنظیم قائم کی جو کبھی کبھی بیان جاری کرتی تھی۔ یہ بیان صلاح الدین صاحب لکھتے تھے۔

تکبیر کی ادارت سنبھال کر انہوں نے بہت شہرت اور عزت کمائی۔ وہ جگہ جگہ مدعو کیے جاتے اور ان کی تقریریں بہت توجہ سے سنی جاتیں۔ کئی بار لندن آئے اور ہر مرتبہ خود اصرار کر کے میرے گھر آئے۔ اس میں کچھ تو ان کا بڑا پن تھا اور کچھ دھوئی ماش کی سفید پھریری دال کھانے کا اشتیاق تھا جو ماہ طلعت اتنے ہی شوق سے ان کے لیے پکایا کرتی تھیں۔

ایک روز کراچی کی ایک بڑی شاہراہ پر دن دہاڑے بھرے مجمع کے سامنے دو

موٹر سائیکل سواروں نے ان کی راہ روکی اور انہیں گولی مار کر جانے لگے۔ پھر کچھ خیال آیا تو وہ واپس آئے اور پستول کی باقی گولیاں بھی ان کے جسم میں اتار دیں۔

انجمنِ تحفظِ حقوقِ ساکنانِ کراچی بھی انہیں بچا نہ سکی۔

صحافت کے میدان کارزار میں جو لوگ نو وارد تھے، ان میں نثار احمد زبیری اور متین الرحمان مرتضٰی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ متین صاحب تو صلاح الدین صاحب کے بعد ہفت روزہ تکبیر کے ایڈیٹر بنے۔ زبیری صاحب آگے چل کر صحافت کے استاد بنے اور تعلیم دینے ملائیشیا تک گئے۔

متین صاحب کی ان ہی دنوں شادی ہوئی اور جلد ہی ایک بیٹی کے باپ بنے جس کا نام انہوں نے خُدیجتہ العظمٰی رکھا۔ میرے اسکوٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر راتوں کو اپنے گھر جایا کرتے تھے۔ مجھے بہت عزیز تھے۔ یہی صورت نثار احمد زبیری کی تھی۔ ذہین نوجوانوں نے صحافت میں داخل ہو کر اس پیشے کو عزت بخشی۔

حسن عسکری فاطمی بے روزگار تھے اور حرّیت میں ملازمت چاہتے تھے۔ میری بھی یہی خواہش تھی۔ بالآخر ان کا محنت کرنے کا جذبہ اخبار کے کام آیا۔ میں نے انہیں مختلف موضوعات دے کر رپورٹیں بنانے کا مشورہ دیا جو اپنے کم تجربے کے باوجود انہوں نے بڑی محنت سے لکھیں۔ اتنی محنت سے کہ ماتری صاحب بھی قائل ہو گئے اور صحافیوں کی اس فصل میں ایک اور پودا لگا۔ حسن عسکری اب صحافت کے سینئر استاد ہیں اور ان کے نام سے پہلے لفظ پروفیسر بھی لگ گیا ہے۔

طاہر احمر ہمارے جنگ اور بی بی سی کے سینئر ساتھی اطہر علی مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کے نام میں لفظ احمران کے سیاسی نظریات کی عکاسی کرتا ہے۔ بہت اچھی نثر لکھتے تھے اور بہت محنتی تھے۔ وہ بھی عرصۂ دراز تک میرے اسکوٹر کی پچھلی نشست کا فیض اٹھاتے رہے۔ حرّیت پر جب برا وقت پڑا اور اس اخبار کو ڈان والوں نے خرید لیا تو عملے کے بہت سے افراد ایک عمارت سے اٹھ کر دوسری میں جا بیٹھے اور بے روزگار نہیں ہوئے۔ طاہر احمر بھی ان میں شامل تھے۔ سنہ 71ء میں جب پاک بھارت جنگ ہو رہی تھی اور رات کے وقت بھارت کے طیارے کراچی کی بندرگاہ پر حملہ کرنے آتے تھے تو چونکہ وہ مقام حریت کے دفتر سے زیادہ دور نہیں تھا، سارا عملہ اپنے ڈیسک چھوڑ کر عمارت کے تہ خانے میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں کو چپ لگ جاتی تھی مگر کچھ لوگوں پر بمباری کے شور کا مختلف اثر ہوتا تھا۔ میرا اشارہ طاہر احمر کی طرف ہے جو تہ خانے کے سناٹے اور

مچھروں کی یلغار میں زور زور سے بولنے لگتے تھے۔ ایسا ہی ایک لمحہ تھا اور طاہر بلند آواز میں بولے جا رہے تھے۔ آخر اخبار کے ایڈیٹر فرہاد زیدی سے نہ رہا گیا اور انہوں نے کہا "طاہر احمر صاحب، ہمیں پتا ہے خوف سے آپ کی جان نکلی جا رہی ہے۔ خدا کے لیے ذرا آہستہ بولیے۔"

اب امریکہ میں رہتے ہیں اور مقامی اخباروں میں لکھتے رہتے ہیں۔

افسر آذر اور نعیم آروی، ان دونوں کا ادبی پس منظر تھا۔ افسر آذر نیوز ڈیسک کے لیے نہایت موزوں کارکن تھے۔ محنت سے کام کرتے تھے اور اپنی خوشگوار شخصیت کی وجہ سے سب کو عزیز تھے۔ صحت ان کی بھی گرتی جا رہی تھی۔ میرے لندن چلے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ چل بسے۔ کچھ یہی حال نعیم آروی کا ہوا۔ اس کی جواں مرگی کا پوری صحافی اور ادبی برادری کو صدمہ ہوا۔ نعیم آروی نہایت عمدہ مختصر کہانیاں لکھنے لگے تھے اور ادبی حلقوں میں نام پا رہے تھے کہ یک لخت وہ کیفیت ہوئی جو جون ایلیا کے شعر میں تھی ؎

کیا وہ جواں گزر گیا
ہاں وہ جواں گزر گیا

شریف کمال عثمانی کے نام پر یاد آیا کہ ہم چار صحافی کراچی کے بہادر یار جنگ اسکول کے طالب علم رہ چکے تھے۔ میں ثناء اللہ، غازی صلاح الدین اور شریف کمال، ہم چاروں نے 1952-53ء میں میٹرک پاس کیا۔ ہمارے ساتھ محمد علی صدیقی بھی تھے جو انگریزی صحافت کی طرف نکل گئے اور روزنامہ ڈان سے وابستہ ہوئے۔ شریف کمال ذرا پیچھے رہ جانے والے طالب علموں میں گنے جاتے تھے۔ صحافت میں بھی انہوں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ عجیب شخصیت تھی۔ مجھے یاد ہے سنہ 65ء کی جنگ کے بعد جب بھارت نے اعلان کیا کہ پاکستان کا فضائی بیڑا مفلوج ہو چکا ہے تو فضائیہ نے کراچی کے بہت سے صحافیوں کو سرگودھا کے فضائی اڈے لے جانے اور صحیح اور سالم موجود طیارے دکھانے اور شمار کروانے کا فیصلہ کیا۔ سب کو صبح ایک جگہ جمع ہو کر کراچی کے ہوائی اڈے پر جانا تھا۔ دیکھا کہ شریف کمال عثمانی گھر کے معمولی کپڑے اور پرانی چپل پہنے چلے آ رہے ہیں۔ خود ان کے سوا سب ہی شرمندہ شرمندہ سے ہوئے۔ بہادر یار جنگ اسکول کے جس طالب علم نے یوم سرسیّد کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ دلّی کے ایک بڑے گھرانے میں لڑکا پیدا ہوا، والدین نے اس کا نام سرسیّد رکھا، وہ شریف کمال ہی تھے۔ بس یہ ضرور ہے کہ اپنے نام کی طرح شریف تھے۔ سادہ تھے۔ خود کو مصروف رکھتے تھے۔ بچوں کی نظمیں

لکھ کر ان کی کتاب شائع کرائی جسے ایوارڈ بھی ملے اور جن نظموں پر مشتمل احمد رشدی جیسے بڑے گلوکار نے البم بنا کر جاری کیا۔ آخر عمر میں شام کے اخبار ایوننگ اسٹار میں تعلیم کے رپورٹر ہو گئے تھے۔

ثناء اللہ اتنے ہی کامیاب اور سرگرم صحافی نکلے۔ انہوں نے ابتداء ہی سے رپورٹنگ کو اپنا پیشہ بنایا اور حریت کے ابتدائی برسوں میں غیر معمولی محنت اور تندہی سے کام کیا۔ جنگ کے دنوں میں راولپنڈی میں جو رپورٹیں اور تصویریں میں بھیجتا تھا، ان کٹھن حالات میں ہر روز ہوائی اڈے جانا اور سارا مواد لے کر آنا ثناء اللہ کی ذمہ داری تھی۔ ان دنوں انہوں نے رپورٹنگ میں بھی بڑا کام کیا۔ اس کے بعد قاہرہ میں پی آئی اے کے بوئنگ کی تباہی کی نہایت عمدہ رپورٹنگ کی اور اکتوبر سنہ 70ء کے دوران مصطفیٰ زیدی کی خودکشی کی اور ان کے ہمراہ شہناز گل کی ناکام خودکشی کے واقعے پر جیسی رپورٹنگ ثناء اللہ نے کی پورے کراچی میں کوئی اور نہ کر سکا۔ بھٹو صاحب پر جب برا وقت پڑا، معاملے کے ہر پہلو کو کرید کرید کر نئی خبریں لانے کا کارنامہ بھی ثناء اللہ نے انجام دیا۔

مجھے ان کا اور اپنا اسکول کا زمانہ ایک اور سبب سے یاد ہے۔ ہوا یہ کہ اسکول کی انتظامیہ نے طے کیا کہ دیوار پر چسپاں کیا جانے والا اخبار تیار کیا جائے (جسے وال پیپر کہا جاتا تھا) اور اس مقصد کے لیے کسی طالب علم کو چن کر ایڈیٹر مقرر کیا جائے۔ ہمارے ریاضی کے استاد اسحاق صاحب کو ایڈیٹر منتخب کرنے کا استحقاق دیا گیا۔ مجھے اور میرے سارے قریبی دوستوں کو یقین تھا کہ مجھے چنا جائے گا۔ اخباروں میں میرے مضامین شائع ہو رہے تھے اور میری لکھی ہوئی بچوں کی ایک کتاب اسکول کی لائبریری میں آ چکی تھی۔

اسحاق صاحب نے ثناء اللہ کو چنا۔ شاید ان کی بھی مجبوری تھی۔ حیدرآباد ٹرسٹ کے پیسے سے یہ اسکول حیدرآبادی لڑکوں لڑکیوں کے لیے قائم کیا گیا تھا اور اصولاً ان ہی کو آگے بڑھنا چاہیے تھا۔ خیر ادھر ثناء اللہ ایڈیٹر مقرر ہوئے، ادھر ہم نے ایک متوازی اخبار کی تیاری شروع کر دی۔ سب لڑکوں نے مضمون اور نظمیں لکھیں (ایک لڑکے کا تخلص سینڈل تھا) میں نے کئی دن لگا کر اخبار کی کتابت کی اور اسے سنوار کر ایسا عمدہ دیواری اخبار تیار کیا کہ جب اسکول کی سالانہ نمائش ہوئی تو اس کے لیے تیار کیے ہوئے خصوصی فریم میں ثناء اللہ کا نہیں، میرا اخبار لگایا گیا۔ اس کے بعد ہم دونوں بہترین دوست بن گئے۔

ثناء اللہ صورت شکل میں ذرا کم تھا، ایک ٹانگ میں تھوڑا لنگ بھی تھا۔ اکیلا تھا اور

اسکول کے ایک ساتھی سیفی کے گھرانے میں رہتا تھا۔ اس کی شادی بھی نہیں ہو پائی اور صحت بظاہر اچھی خاصی تھی۔ خدا جانے کون سا عارضہ تھا جس نے اسے مار کر ہی دم لیا۔

ہمارے ساتھی احمد حمید اُس وقت کے مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور ڈیسک پر کام کرنے والے اچھے صحافی تھے۔ بال بچے دار تھے اور حریت کے مشکل دنوں میں خدا جانے کیسے گزارا کرتے تھے۔ اُن ہی دنوں حکومت نے کراچی کے زیرِ تعمیر علاقے گلشن اقبال میں صحافیوں کو پلاٹ دینے کا اعلان کیا۔ اس میں ایک پلاٹ کے دو امیدوار تھے، میں اور احمد حمید۔ قرعہ اندازی ہوئی اور قرعہ میرے نام نکلا۔ اس روز مجھے اپنی کامیابی کی خوشی نہیں ہوئی۔ اخبار کے ساتھ ساتھ ہم سب کے مالی حالات ابتر تھے۔ اس لیے میں نے وہ پلاٹ قبول کر لیا۔

حریت میں پروان چڑھنے والی نسل میں خواجہ رضی حیدر بھی تھے جو آگے چل کر اسکالر بنے اور قائداعظم اکیڈمی سے وابستہ ہو کر شہرت اور عزت پائی۔ حیدرآباد سندھ میں ہمارے نامہ نگار شیخ محمد مبین بڑے کام کے آدمی تھے۔ جھکاؤ ان کا بھی جماعت کی طرف تھا مگر بہت اچھے نامہ نگار اور اتنے ہی اچھے اور خیال رکھنے والے دوست تھے۔ میں نے بی بی سی میں شمولیت کے بعد چاہا کہ ان سے کام لیا جائے مگر ان کے حریف زیادہ تیز و طرار نکلے۔

نیوز ڈیسک پر آفتاب سیّد بھی طلوع ہوئے اور کامیاب صحافی بنے۔ طاہر نصیر بھی نمودار ہوئے اور اس فروغ پاتی ہوئی نسل میں انہوں نے بھی اپنا مقام بنایا اور بیک وقت چار بچے پیدا کر کے نسل انسانی کو بھی فروغ دیا۔ لطیف احمد خاں اگرچہ اسلامیہ کالج کے استاد تھے مگر حریت کے کھیلوں کے شعبے کے ایڈیٹر بھی تھے۔ خوش مزاج اور خوش گفتار دوست تھے۔ اپنے قد کی وجہ سے استاد کم اور صحافی زیادہ نظر آتے تھے مگر جو طویل القامت شخص اس پیشے میں معمہ بھی تھا اور پہیلی بھی، وہ داؤد سبحانی تھا۔

خدا جانے کہاں سے آیا اور ماتری صاحب کو شیشے میں اتار لیا۔ دنیا زمانے کا کوئی بھی کام ہو جو کسی دوسرے سے نہ ہو سکے، داؤد سبحانی پلک جھپکتے میں کرا لاتا تھا۔ حریف اخباروں کی جاسوسی کرنے سے لے کر تار گھر میں آنے والے دوسروں کے ریڈیو فوٹو کی کاپی اسمگل کرا لینے تک سارے اچھے برے کام اِس مہارت سے کرتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ میں نے جتنا عرصہ اُس کے ساتھ گزارا، معلوم نہیں کب، کس وقت اور کن دنوں وہ کس اخبار کے لیے کیا کام کرتا رہا۔

بہت اچھا اخباری فوٹوگرافر بھی تھا۔ آخر اس نے اپنی فوٹو ایجنسی کھول لی اور ایوب خان کے بیٹے گوہر ایوب سے اس کا افتتاح کرایا۔ میں لندن چلا گیا اور اس دوران اس کی مصروفیات کی خبریں ملتی رہیں۔ پھر میرا کراچی جانا ہوا تو دیکھا کہ سبحانی بری طرح لنگڑا رہا ہے۔ پتا چلا کہ کسی سرکس میں نیچے کھڑا اونچے جھولے پر کرتب دکھانے والی کسی لڑکی کی تصویریں اتار رہا تھا۔ فلیش کی تیز روشنی سے لڑکی کی آنکھیں چکا چوند ہوئیں، جھولا اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور وہ ٹھیک داؤد سبحانی کے اوپر گری۔ وہ خود تو بچ گئی مگر سبحانی کی ہڈیاں چکنا چور ہوئیں۔ پھر اس کی صحت سنبھل نہ سکی اور وہ سرکس کے جھولے سے بھی اونچے عالم بالا میں بیٹھا سوچ رہا ہوگا کہ کاش وہ اپنا کیمرہ ساتھ لے آتا۔

اس پر یاد آیا کہ سنہ 65ء کی جنگ چھڑتے ہی وہ خاموشی سے پنجاب کے محاذ پر اس جگہ جا پہنچا جہاں بھارت اور پاکستان کے ٹینکوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ایسے ہی ایک مقام پر پاکستانی فوج کو انتہائی رازداری میں جرمن ساخت کے کوبرا میزائل فراہم کر دیے گئے تھے۔ ان میزائلوں سے ایک تار جڑا ہوتا تھا جس کے ذریعے یہ کسی بھی ٹینک کو نشانہ بنا کر پل بھر میں تباہ کر سکتے تھے۔ فوجیوں کے جذبۂ جہاد نے زور مارا اور انہوں نے بھارت کے ٹینکوں پر بس نہ چلا تو بھارت کے فوجی ٹرکوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ بھارت نے فوراً ہی اپنے ٹینک پیچھے ہٹا لیے۔

داؤد سبحانی اپنے مخصوص جوڑ توڑ کر کے میدان جنگ میں جا پہنچا اور ایک خندق میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا جہاں سے سر نکالیں تو ٹینکوں کی لڑائی صاف نظر آتی تھی۔ آخر اس سے صبر نہ ہوا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے کر کے کیمرے کو خندق سے باہر نکالا اور جنگ کی تصویریں بنانے لگا۔ اتنے میں کسی فوجی افسر کی نگاہ پڑ گئی اور وہ چلایا ''خبردار، یہ کوئی کھیل نہیں ہو رہا ہے۔''

ایسا تھا ہمارا ساڑھے چھ فٹ کا لمبا چوڑا داؤد سبحانی جسے دیکھ کر یہی کہا جا سکتا تھا کہ سبحان تیری قدرت۔

اور آخر میں ایک باکمال شخصیت جسے فخر ماتری ہاتھ پکڑ کر اپنے ادارے میں لائے اور وہ تھے سیّد ارشاد حیدر عرف زیدی کارٹونسٹ۔ زیدی لاہور کے نہایت معیاری ہفت روزہ لیل و نہار میں بے مثال کارٹون بنا کر شہرت پا چکے تھے۔ اس جریدے کے ایڈیٹر فیض احمد فیض تھے اور سارے ہی ترقی پسند ادیب شاعر لیل و نہار کی شہرت میں حصے دار تھے۔ پاکستانی معاشرے میں ایسے لوگوں کا گزارا نہیں اس لیے لیل و نہار دم توڑ گیا اور ایسے میں ارشاد حیدر زیدی حریت کے

راستے اخباری صنعت میں داخل ہو گئے اور آج تک وکٹوں پر کھڑے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ زیدی کارٹونسٹ حریت کے اس قافلے میں شریک تھے جو غیر معمولی جذبہ لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ ان پر نئے نئے خیالات کی بارش ہوئی اور انہوں نے بے مثال کارٹون بنائے۔ ہفتے میں ایک روز تو پورے ایک صفحے پر اپنے کارٹون پھیلا دیتے تھے جن کا عنوان تھا: ''شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے۔'' وہ اساتذہ کے مشہور شعروں سے متاثر ہو کر سلسلہ وار کارٹون بناتے تھے۔

زیدی بہت کم گو ہیں مگر جب بھی بولتے ہیں تو کسی اچھے کارٹون کے کیپشن جیسی بات کہتے ہیں۔ اب جیو ٹی وی چینل سے وابستہ ہیں اور اول جلول کے متحرک کارٹون بناتے ہیں۔ ان کے مکالمے خود لکھتے ہیں جنہیں سن کر بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے ''کیا بولتا یار۔''

میری یادداشت کتنی ہی اچھی سہی مگر جانتا ہوں کہ کتنے ہی نام اب بھی رہے جاتے ہیں۔ صہبا اختر مرحوم کو ماتری صاحب سے میں نے ملوایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قطعوں اور نظموں کو شہرت حاصل ہوئی۔ حریت پر زوال آنے کے بعد میں نے جو تھوڑا سا عرصہ روزنامہ مشرق میں گزارا وہاں اگرچہ عنایت اللہ صاحب روزانہ قطعہ چھاپنے کے حق میں نہیں تھے مگر میں نے اصرار کیا کہ یہ کراچی کے اخباروں کا مزاج ہے، آپ صہبا اختر سے مل لیجیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا یہ گمنام شاعر جو کبھی راشن کارڈ بنانے والے دفتر میں انسپکٹر تھا، کراچی کے نامور شاعروں میں شمار ہونے لگا اور میں جب بھی اس کے نام کی ایک بڑی سڑک دیکھتا ہوں، اس کے ساتھ گزرے ہوئے وہ اچھے برے دن یاد آتے ہیں۔

عبدالرؤف عروج کا ذکر اگرچہ ہو چکا ہے مگر ماتری صاحب کے حریت میں ادبی صفحہ اور ڈان کے حریت میں ادبی گزٹ ترتیب دے کر انہوں نے اخبار کی نام وری میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ عروج صاحب سب سے بنا کر رکھتے تھے مگر اپنا حال کبھی نہ بنایا نہ سنوارا۔ درویشوں کی صفت تھی اور ہر ایک ان کا احترام کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز صدر میں فٹ پاتھ پر بیٹھے وہاں بکنے والی پرانی کتابیں دیکھ رہے تھے اور اپنی عادت کے مطابق ایک ہاتھ سے کتابیں دیکھتے جاتے اور دوسری ہتھیلی پھیلائے ہوئے تھے۔ اتنے میں کوئی راہ گیر ان کی ہتھیلی پر ایک اٹھنی رکھ گیا۔ ایسے ہی لوگوں کو کسی نے آزاد مرد کے نام سے اپنی شاعری میں باندھا ہے۔

یہ فہرست یہاں ختم نہیں ہوتی۔ کتنے ہی لوگ تھے جو کسی نہ کسی شکل میں حریت کی مقبولیت میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ ماتری صاحب کے گجراتی اخباروں کے ساتھی فلم کے صفحے

کے لیے مواد لے آتے تھے اور ان ہی اخباروں کے بزنس رپورٹر منڈی کے رجحان کی رپورٹیں دے جاتے تھے۔ شام کے اخبار لیڈر سے وابستہ غازی صلاح الدین نے شروع میں باقاعدگی سے لکھا اور پھر سنہ 65ء کی جنگ میں اسٹالن گراڈ کی روداد رقم کی۔

ایک اور بڑا حصہ ڈالنے والے بابائے براڈ کاسٹنگ ذوالفقار علی بخاری تھے جو ماتری صاحب کے بہت عزیز دوست تھے۔ اتنے عزیز کہ اخبار کو بغور دیکھ کر اور اس پر نشان لگا کر لاتے تھے اور ہم لوگوں کی غلطیاں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

انہوں نے بڑا کارنامہ انجام دیا اور حریت کے لیے مشہور و معروف "بخاری کی سرگزشت" لکھی۔ اتنی لطیف اور خوشگوار تحریر تھی کہ اس کے باب کے باب ہمیں آج تک یاد ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے شروع شروع کے دنوں کا ایسا احوال پھر کوئی دوسرا نہ لکھ سکا۔

اس مقام پر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ روزنامہ حریت کے شروع شروع کے دنوں کا یہ احوال جو میں لکھ رہا ہوں، عرصۂ دراز تک راہ تکنے کے بعد لکھ رہا ہوں کہ شاید کوئی دوسرا اس راہ میں قدم اور قلم اٹھائے۔ میں لندن میں بیٹھا ہوں اور اس تحقیق میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آ رہی ہیں مگر چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ اردو صحافت کے تاج محل کی تعمیر کے بچے کھچے چشم دید گواہ ایک ایک کر کے اٹھ جائیں، میں اپنے ذہن کے اس خانے کو الٹ دوں جس کی تہ میں کچھ یادیں اب بھی پڑی ہیں۔

یہاں سے اس صورتحال کا ذکر شروع ہوتا ہے جسے اخباری زبان میں سانحۂ ارتحال کہتے ہیں۔

ہوا یہ کہ یہ جو میلہ لگا تھا، اس کی رونق کو کسی کی نظر کھا گئی۔ وہ مخبر جو فخر ماتری کے پاس آ کر ان کے کان میں کہا کرتے تھے کہ اخبار جنگ کے مالک میر خلیل الرحمان کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور ان کے سینے میں درد رہنے لگا ہے، ان مخبروں کو خود بھی خبر نہ تھی کہ اخبار جنگ کے چھاپہ خانے میں ایک پہاڑ جیسی مشین لگ رہی ہے۔ اب تک اخبار چھاپنے والی چھوٹی مشینوں میں بیس انچ چوڑے اور تیس انچ لمبے کاغذ کی شیٹ ڈالی جاتی ہے۔ پہلے اس کے ایک رخ پر دو صفحے چھپتے تھے، پھر اسے پلٹ کر ڈالا جاتا ہے تو اس طرح چار صفحے چھپ کر تیار ہوتے ہیں۔ پھر اس طرح دوسری شیٹ کو الٹ پلٹ کر مزید چار صفحے چھاپے جاتے ہیں۔ پھر جلد ساز بیٹھ کر ان کاغذوں کو بیچ سے موڑ کر آٹھ صفحوں کا اخبار تیار کرتے ہیں۔

جنگ میں راتوں رات روٹری مشین نصب ہو رہی تھی۔ جس میں ایک طرف رول کی شکل میں لپٹا ہوا میلوں لمبا کاغذ لگا کر مشین چلا دی جاتی ہے اور دوسری طرف دیکھتے دیکھتے حسب خواہش تعداد میں صفحات کا اخبار چھپ کر نکلتا جاتا ہے اور آپ چاہیں تو مشین اخباروں کو گن کر ان کے بنڈل بھی تیار کر سکتی ہے۔ یہی نہیں، اس اخبار کا سائز بیس تیس انچ کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اب جو سائز تیار ہو کر نکلے گا جنگ نے اسے جہازی سائز کا نام دے کر اعلان کر دیا کہ کل صبح سے جنگ جہازی سائز میں شائع ہوگا۔

حریت اچانک بونا ہو گیا۔

ماتری صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے چھاپے خانے کی مشینیں خریدنے خود جرمنی گئے تھے۔ مشین بنانے والوں نے انہیں مشورہ دیا کہ تھوڑی سی رقم اور ڈال کر بڑے سائز کی مشینیں خریدیں۔ بے شک ان میں چھوٹا اخبار ہی چھاپیں لیکن جس روز ضرورت پڑے ان ہی مشینوں پر بڑا اخبار چھاپنا شروع کر دیں۔ ماتری صاحب نے یقیناً اسی تھیٹر کے مکالمے کے انداز میں کہا ہوگا کہ جی نہیں، پاکستان میں سارے اخبار بیس تیس سائز کی شیٹ پر نکلتے ہیں۔

اب جو نکلا وہ روزنامہ حریت کا دم تھا۔ اخبار کو ایسا زوال ہوا کہ وہ منظر دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس کے وسائل ختم ہونے لگے۔ تنخواہوں میں تاخیر ہونے لگی۔ آخر وہ دن آ گیا کہ جب تین تین ماہ کی تنخواہیں چڑھ جاتیں تو ماتری صاحب جو دوسروں کو اپنے کمرے میں بلایا کرتے تھے، اب دوسروں کے دفتروں میں جانے لگے اور خدا جانے کہاں کہاں سے کیسی کیسی تاویلیں پیش کر کے قرضے لاتے، تب جلدی جلدی نوٹ گنے جاتے اور ہم لوگوں کو کچھ نہ کچھ رقم دے دی جاتی۔

اُن دنوں مجھے ایک روز اُن کے کمرے میں بلایا جانا یاد ہے۔

ماتری صاحب یوں بیٹھے تھے جیسے میلوں دور تک دوڑ کر آئے ہوں اور مزید دوڑنے کی سکت نہ ہو۔ مجھ سے بولے ''عابدی! اب کیا کریں۔ لوگوں کو وقت پر تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔''

میں نے کہا کہ ''میرا تو یہاں اپنا گھر ہے۔ میرے کام رکنے والے نہیں، لیکن جن گھرانوں کا سارا نظام ماہانہ تنخواہوں پر چلتا ہے، وہ لوگ کیسے جیئیں گے۔''

وہ چپ ہو گئے اور پھر یہ چپ طول کھینچ گئی۔ ☆

---------O---------

☆ فخر ماتری کا انتقال 6 مارچ 1966ء کو کراچی میں ہوا۔

تیسرا قدم

دفتر میں بحث یہ چھڑی کہ ماتری صاحب کے انتقال کی خبر کو صفحہ اوّل پر پہلی خبر بنایا جائے یا دوسری خبر۔ میرا اصرار تھا کہ یہ ہمارا خانگی سانحہ ہے، قومی سانحہ نہیں۔ خبر نمایاں طور پر ضرور چھاپی جائے مگر شہ سرخی نہ بنایا جائے۔

ماتری صاحب ہوتے تو جانتا ہوں، وہ میری بات مان لیتے۔

مجھے یاد ہے انہوں نے میری ایک بات نہیں مانی تھی اور ایک بات مان لی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ پی آئی اے کی افتتاحی پرواز پر مجھے قاہرہ بھجوا دیجیے۔ وہ نہیں مانے۔

پھر دولتِ مشترکہ کی طرف سے دعوت نامہ آیا کہ اپنے کسی کارکن کو برطانیہ میں صحافت کی تربیت کے لیے نامزد کر دیجیے۔ انہوں نے میری بات جھٹ مان لی، ٹائپسٹ کو بلا کر میرے سامنے خط لکھوایا جو اسی روز ڈاک میں چلا گیا۔

کچھ روز بعد ہی جواب آ گیا۔ مجھے انٹرویو کے لیے لاہور بلایا گیا تھا مگر لاہور جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ درکار تھا۔ دفتر سے تنخواہ ہی بمشکل مل رہی تھی، وہاں سے کرائے کی رقم مانگنے کی جرأت مجھ میں نہیں تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا، ہر کونے کھدرے کو ٹٹولا گیا تو اتنی رقم نکل آئی کہ میں لاہور چلا گیا۔

انٹرویو لینے والوں میں مختار مسعود بھی تھے۔ ابھی تک ان کی بے مثال تحریریں پردۂ غیب میں تھیں۔ ابھی تک ان کی قلم کاری کے بھید نہیں کھلے تھے۔ انٹرویو کے دوران انہوں نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی اس کا علم بعد میں ہو گا مگر میں نے ان کے بارے میں جو رائے

قائم کی وہ یہ تھی کہ ان کی آنکھوں اور پیشانی سے ذہانت جھانک کر اپنے خوب خوب ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔

مجھے یاد ہے، میں نے کوئی خاص انٹرویو نہیں دیا۔ اس وقت تک میں نے صحافت میں کوئی تیر نہیں مارا تھا۔ چنانچہ کچھ ایسے ہی سوال کے جواب میں مجھے اظہارِ معذرت کرنا پڑا۔ بعد میں میرے ذہن میں لاکھ خیالات اُمڈ پڑے کہ یہ کہتا اور یہ کہتا مگر وہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ جو بات یہاں پر کہنے کی ہے، وہ یہ کہ میں چن لیا گیا۔

اُس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ آنکھیں بند کرتا تھا تو برطانیہ نظر آنے لگتا تھا، آنکھیں کھولتا تھا اور زیادہ روشن برطانیہ دکھائی دیتا تھا۔

اس وقت میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ برطانیہ جانے کا ٹکٹ مجھے اپنی جیب سے خریدنا ہوگا۔

اجمل دہلوی پرانے صحافی ہیں، تقریباً اتنے ہی پرانے جتنا پرانا صحافت کا پیشہ ہے۔ جنگ کے مقابلے پر کوئی اخبار نہ ٹھہرا تو انہوں نے اخبار "امن" نکالا۔ آخری خبریں آنے تک زندہ اور سلامت تھے۔ خود اجمل دہلوی اس بیچ سیاست کے میدان میں اتر گئے تھے، اب یوں ہے کہ ہر چند کہیں کہ نہیں ہیں مگر ہیں۔

ایک روز اُن کا فون آیا۔ ملنا چاہتے تھے۔ ان دنوں وہ کراچی کے مشہور اور قدیم روزنامہ انجام سے وابستہ تھے اور جنگ کے سوا دوسرے اخبارات کی ناؤ ڈول رہی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب ایوب خان کی حکومت نے اخبارات پر قابو پانے کے لیے نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کیا اور اس ٹرسٹ نے ملک کے کئی اخبار خرید لیے۔ مخالفت کے سارے راستے وہیں بند ہو گئے۔

سننے میں آ رہا تھا کہ این پی ٹی (یہی ٹرسٹ) اردو روزنامہ انجام خرید رہا ہے جسے بعد میں روزنامہ مشرق کا نام دے دیا جائے گا اور لاہور میں اخبار مشرق جو پہلے ہی ٹرسٹ کی تحویل میں جا چکا ہے، کراچی آ کر انجام کو اس کے انجام تک پہنچا دے گا اور پھر دنیا مشرق سے ابھرتے ہوئے نئے اخبار کو دیکھے گی جس کی نگرانی دنیائے صحافت کی عظیم شخصیت یعنی عنایت اللہ صاحب کریں گے۔

اُن کی بات ذرا دیر بعد، پہلے کچھ ذکر روزنامہ انجام کا ہو جائے۔

یہ اخبار تقسیمِ ہند سے پہلے دلّی سے نکلتا تھا اور مسلمانوں کا بڑا اور معتبر ترجمان سمجھا جاتا

تھا۔ آزادی کے بعد انجام اٹھ کر کراچی آ گیا جہاں اسے دفتر کے قیام کے لیے شاندار عمارت ملی اور انجام کراچی کا سب سے بڑا اردو اخبار ثابت ہوا۔ بعد میں یہ منصب روزنامہ جنگ کو ملا لیکن انجام کی مقبولیت برقرار رہی۔

اس اخبار نے بھی نذیر ناجی اور سلطانہ مہر سے لے کر عثمان آزاد اور سردار علی صابری تک ہر طرح کے صحافی پیدا کیے اور اس کے خاتمے کے بعد بھی عرصے تک اس کے حوالے دیے جاتے رہے۔

انجام کے تعلق سے صحافی برادری میں ایک واقعہ بہت لطف لے کر دہرایا جاتا ہے۔ یہ 11 ستمبر 1948ء کی بات ہے۔ رات گزری چلی جا رہی تھی اور کوئی ایسی بڑی خبر نہیں آ رہی تھی جسے شہ سرخی بنایا جائے۔ اخبار کے مالک سے لے کر معمولی پروف ریڈر تک سب سرگرداں تھے کہ کوئی بڑی خبر ہاتھ لگے۔ رات کے اُس سناٹے میں ٹیلی پرنٹر اچانک چل پڑا۔ لوگ چونکے۔ نیوز ایڈیٹر اپنی کرسی سے اٹھا۔ ٹیلی پرنٹر کی طرف دوڑا۔ اس سے نکلے ہوئے کاغذ کو ہاتھوں میں لے کر ٹائپ ہونے والی خبر کو پڑھا اور خوش ہو کر نعرہ لگایا ''لیڈ (Lead) آ گئی۔'' سارا عملہ چلایا ''کیا؟؟؟؟'' نیوز ایڈیٹر بولا ''قائداعظم مر گئے۔'' اس کے بعد نیوز ایڈیٹر کی جو درگت بنی وہ نہ ہی بیان کی جائے تو اچھا۔

ذکر ہو رہا تھا عنایت اللہ صاحب کا جو اخباری دنیا کے جادوگر تھے۔ انہوں نے برطانیہ کے اخباروں کو اتنے قریب سے دیکھا اور سمجھا کہ یہ اخبار اُن سے مشورے مانگنے لگے۔ مثال کے طور پر یہ وہ دن تھے جب برطانیہ میں ٹیلی ویژن فروغ پا رہا تھا اور شام کے وقت لوگ سارے کام چھوڑ کر ٹی وی دیکھا کرتے تھے۔ اسی مقبولیت کی وجہ سے ہر اخبار پر یہ لازم تھا کہ ہر روز ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی تفصیل چھاپے۔ یہ تفصیل بہت زیادہ پڑھی جاتی تھی مگر ہر اخبار اپنی مرضی کے مطابق اسے اندر کے مختلف صفحوں پر چھاپتا تھا۔

عنایت اللہ صاحب نے اُن سب کو مشورہ دیا کہ اگر ٹی وی کا پروگرام اتنا ہی اہم اور مقبول ہے تو اپنے پڑھنے والوں کو اندرونی صفحوں میں کیوں الجھاتے ہو۔ سب سے آسانی سے دیکھا جانے والا صفحہ یا تو پہلا ہوتا ہے یا آخری۔ کیوں نہ ٹیلی ویژن پروگراموں کی تفصیل آخری صفحے پر چھاپی جائے۔

سارے اخباروں نے یہ تجویز مان لی اور برسہا برس ہر اخبار نے عنایت اللہ صاحب

کے مشورے پر عمل کیا۔ اب ٹی وی پیچھے چلا گیا ہے اور فٹ بال سبقت لے گیا ہے۔ اس لیے زیادہ تر اخباروں کے آخری صفحے پر کھیلوں کی خبریں چھپتی ہیں۔

عنایت اللہ صاحب نے برطانیہ میں قیام کے دوران ایک کام اور کیا۔ یہاں آباد اردو پڑھنے والے لوگ برصغیر کی خبروں کو ترستے تھے۔ پاکستانی اخبار کئی روز بعد آتے تھے اور ریڈیو پاکستان کی خبریں مشکل ہی سے سنائی دیتی تھیں۔ عنایت اللہ صاحب نے ایک کمال کیا۔ برطانیہ سے ہفت روزہ مشرق جاری کر دیا۔ نہایت معیاری اور سلیقے سے ترتیب دیا ہوا یہ رسالہ بہت مقبول ہوا۔ اس کو ترتیب دینے کے کام میں انہوں نے محمود ہاشمی صاحب کو ساتھ ملا لیا۔ وہ بھی اسی قدر سلیقہ مند تھے۔ عنایت اللہ صاحب کے لاہور چلے جانے کے بعد بھی وہ ہفت روزہ مشرق باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ سنہ 70ء کے لگ بھگ میں انہیں ہر ہفتے خبروں اور تصویروں کا ایک پیکٹ بھیجا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں وہ کراچی آئے تو میرے ڈاک خرچ کی ایک ایک پائی مجھے ادا کی۔

محمود ہاشمی صاحب دراصل تعلیم کے آدمی ہیں اور اردو سکھانے کا ایک لاجواب قاعدہ ترتیب دے چکے ہیں لیکن انہیں زیادہ شہرت اُن کی تصنیف ''کشمیر اداس ہے'' کی وجہ سے حاصل ہے۔ بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور شہر برمنگھم میں آباد ہیں۔

کراچی سے نیشنل پریس ٹرسٹ یعنی سرکار کا اخبار مشرق نکالنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں اجمل دہلوی سے انکار نہ کر سکا کیونکہ حریت کی حالت نازک تھی اور فخر ماتری صاحب کے بڑے بیٹے انقلاب ماتری کو اسے سنبھالنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اخبار پر بھاری قرض بھی چڑھ چکا تھا اور عملے کو تنخواہوں کی تقسیم میں اور زیادہ تاخیر ہونے لگی تھی۔

میں نے روزنامہ انجام میں حاضری لگائی، جہاں عملے کی تربیت شروع ہو چکی تھی۔ عنایت اللہ صاحب گُر کی باتیں اجمل دہلوی کو سمجھاتے اور اجمل صاحب وہ سوغات باقی عملے کے سپرد کر دیتے۔ یہ سلسلہ چند روز چلا۔ انجام کراچی کی میکلوڈ روڈ کی شاندار عمارت سے اٹھا اور پی ای سی ایچ ایس کے نام سے مشہور سوسائٹی کے علاقے میں نرسری کے قریب ایک بڑی سی دو منزلہ عمارت میں منتقل ہو گیا۔

انجام راتوں رات مشرق ہو گیا۔

ہم نے نعرہ لگایا کہ ہم بھی ہیں سرکار کے۔

اجمل دہلوی، عنایت اللہ صاحب کی یہ ہدایت ہم لوگوں کے سپرد کرتے کرتے کہ خبر کی

سرخی میں شہر، قصبے، گاؤں، علاقے یا محلے کا نام ضرور لکھا جائے، خود خدا جانے کس خطے میں غائب ہو گئے۔ اس کی بجائے لاہور سے اردو صحافت کے دو بڑے ستون اقبال زبیری اور فرہاد زیدی کراچی آ گئے۔ انجام کے زیادہ تر ملازم جن کا تعلق کراچی ہی سے تھا، برقرار رہے۔ دو ایک لاہوری صحافی بھی کراچی پہنچ گئے۔

لوگ مانیں گے نہیں مگر صاف بات ہے کہ مجھے کراچی اور لاہور کے صحافیوں میں کچھ ویسا ہی فرق نظر آیا جو فرق سمندری اور لاہوری نمک میں ہوتا ہے۔ سمندری نمک سے سر پھوڑنا مشکل ہے۔

عنایت اللہ صاحب کتنے ہی صاحبِ کمال سہی، شریف گلزار کے بغیر اُن کی شخصیت نامکمل تھی۔ شریف گلزار غضب کے خطاط تھے۔ ایسے کہ انہیں کاتب کہتے ہوئے عجب سا لگتا ہے۔ قلم اُن کے ہاتھ میں آنے کے بعد کاغذ پر تیرتا تھا۔ صفحوں کو سنوارنے اور سجانے کا ہُنر انہیں خوب خوب آتا تھا اور عنایت اللہ صاحب کی آنکھوں میں اگر لندن کے روزنامہ ایکسپریس کے صفحات خواب کی طرح نازل ہوتے تھے تو انہیں مشرق کے صفحات پر حقیقت کر دکھانے کا آرٹ شریف گلزار کو آتا تھا۔ ویسے بھی وہ اخبار کے آرٹ ڈائریکٹر کہلاتے تھے۔

ادھر خود اخبار کے اندر موجود دو ستون آپس میں ٹکرائے، اقبال زبیری اور فرہاد زیدی کے درمیان چشمک کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ یہ دونوں مشرق لاہور میں تھے تو اخبار کا عملہ دو کیمپوں میں بٹا ہو گا لیکن کراچی میں صورتحال مختلف تھی۔ یہاں کا مقامی عملہ اس بٹوارے سے لاتعلق تھا۔ بعد میں جیسے جیسے لاہور کے صحافی کراچی آتے گئے وہ کھینچا تانی یہاں بھی نظر آنے لگی۔

کراچی کے اخبار کو بالکل لندن کا اخبار بنانے کا عمل ایک روز ہم نے بھی دیکھا۔ ہوا یہ کہ کہیں وسطی ایشیا کی کسی جمہوریہ کا مال بردار ہوائی جہاز کراچی کے ہوائی اڈے سے اڑا ہی تھا کہ ایک غیر آباد علاقے میں گر پڑا۔ اس کے عملے کے جو آٹھ دس افراد تھے، سارے کے سارے مر گئے۔ شہر میں شور بلند ہوا کہ ڈرگ روڈ میں کوئی ہوائی جہاز گر گیا ہے۔ اس روز اخبار کی کمان عنایت اللہ صاحب نے سنبھالی۔ سارے رپورٹروں کو طلب کر لیا گیا۔ اُن کو صورتحال سمجھائی گئی اور ہر رپورٹر کو معاملے کے ایک ایک پہلو کی خبریں لانے کی ذمہ داری سونپ کر انہیں میدان میں اتار دیا گیا۔ شام تک خبروں اور تصویروں کا انبار لگ گیا اور صبح تک پورا اخبار طیارے کے حادثے کی خبروں سے آراستہ تھا۔ اخباری اصطلاح میں عنایت اللہ صاحب ہر رپورٹ کو فیچر بنا دینے کے

قائل تھے۔ بدقسمتی سے کراچی کے باشندے اس حادثے سے اوراس کی خبروں سے لاتعلق رہے۔
حریت سے میرے ساتھی ثنا اللہ بھی مشرق میں آ گئے۔ عنایت صاحب کو رضامند کر کے میں صہبا اختر کو بھی لے آیا ورنہ لاہور والے اخبار میں قطعہ چھاپنے کے عادی نہیں تھے۔ مقامی عملے میں نیوز ڈیسک پر حفیظ صاحب اور بلند اقبال بھی تھے۔ حفیظ صاحب بعد میں انگریزی صحافت کی طرف چلے گئے۔ بلند اقبال جن کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا، انجام کے بہت پرانے صحافی تھے اور اپنے کام کے ماہر تھے یعنی انہیں انگریزی برائے نام آتی تھی لیکن انگریزی عبارت کا مطلب یوں نکال لیتے تھے جیسے انہیں اردو سے زیادہ انگریزی پر عبور حاصل ہو۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب ہر جملے میں انگریزی کے تین تین چار چار لفظ لکھنے کا چلن نہیں تھا۔

بلند اقبال کو ایک فن اور بھی آتا تھا۔ پاکستان کی سرحد کے قریب بھارتی فوجوں کی نقل وحرکت کی خبر دل سے گڑھتے تھے لیکن اس اعتماد کے ساتھ جیسے خود پوری سرحد کا معائنہ کر کے آئے ہوں۔ ایک بار جب کچھ کرنے کو نہیں تھا، انہوں نے راجستھان سیکٹر میں بھارتی فوجوں کے حرکت میں آنے کا واقعہ اس طرح لکھا کہ اخبار چھپتے ہی فوجی انٹیلی جینس والے اخبار کے دفتر میں آئے اور کہا کہ ہماری اطلاع تو اس سے مختلف ہے۔ آپ کو یہ اطلاعات کہاں سے ملیں۔ انہیں سمجھا بجھا کر رخصت کیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بلند اقبال کچھ عرصے ایک اردو خبر رساں ادارہ چلاتے رہے اور اس میں اسی طرح کی فرضی خبریں آتی رہیں جن پر ہم بڑی بڑی سرخیاں لگاتے رہے۔ عرصہ ہوا، انہوں نے بہشت میں ڈیرے لگالیے ہیں۔

ہمارے ایک ساتھی نقی بھی تھے جو یوں تو کھیلوں کے رپورٹر تھے لیکن حلیے اور حرکتوں سے پنجابی سوداگران دلّی لگتے تھے۔ دفتر میں آتے ہی وہ پہلے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالتے۔ بڑے اطمینان سے وہ نوٹ شمار کرتے اور پھر اتنے ہی اطمینان سے دوبارہ ان کی گڈی بنا کر جیب میں اُڑس لیتے۔

ایک جرائم کے رپورٹر تھے جن کا نام میں نہیں لکھوں گا کیونکہ جب کبھی کوئی جرم کی خبر نہیں ملتی تھی تو وہ خود جرم کر ڈالتے تھے۔ ایک روز دفتر میں چرس لے آئے اور سب سے اصرار کرنے لگے کہ چکھو۔ پھر کسی خفیہ بیوی کا فضیحتہ ہوا اور معاملہ پولیس کچہری تک جا پہنچا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ کرائم رپورٹر نہیں، کریمنل رپورٹر ہیں۔ ہوتے ہیں ایسے بھی لوگ۔

لاہور سے آنے والے صحافیوں میں ارشاد راؤ بھی تھے۔ پیشے کے اعتبار سے رپورٹر

تھے۔انہیں جہاں گشت رپورٹر لگایا گیا۔ میں نے انہیں بہت کم جانا لیکن اتنا ضرور جانا کہ ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔انہیں دور دور تک رسائی حاصل تھی۔ دوسری بار ان کا ذکر اس وقت سنا جب بھٹو صاحب پر برا وقت پڑا۔ان کے کرائے ہوئے انتخابات کو سیاستدانوں نے نہیں مانا اور ان کے خلاف تحریک چل پڑی۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں خبر آئی کہ بھٹو صاحب اپنے گھر میں اکیلے ہیں اور ان کے پاس صرف دو صحافی موجود ہیں: نذیر ناجی اور ارشاد راؤ۔اُن دنوں بھٹو صاحب نے بھیانک فیصلے کیے۔

نذیر ناجی اب بہت وزن دار شخصیت ہیں، ارشاد راؤ خدا جانے اب کس کے مشیر ہیں۔

روزنامہ مشرق کے آرٹ ڈائریکٹر کے نائب طاہر شاہ زیدی تھے جو صفحات کو آراستہ کرنے کے ماہر تھے۔ بعد میں کسی وقت وہ روزنامہ حریت سے وابستہ ہوئے۔ہم سب انہیں شاہ صاحب کہتے تھے۔ پنجاب میں سیّدوں کو شاہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ طاہر شاہ کب اور کیسے زیدی کہلائے، ان سے گہری دوستی کے باوجود یہ راز نہیں کُھلا۔شاہ صاحب بہت باکمال آدمی تھے۔ اخبار کے صفحے بناتے بناتے وہ مخصوص گوند ان کی انگلیوں سے چپک کر خشک ہو جاتا تو اکثر اسے نوچ کر الگ کرتے نظر آتے۔ان کی گوری رنگت پر اُن کا چشمہ بہت بھلا لگتا تھا۔بہت ذہین بھی تھے اور اخبار کے صفحوں کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے میرے ساتھ مل کر ہر اختراع میں شریک ہوتے تھے۔ نیک بہت تھے۔اس کا اظہار اس وقت ہوا جب حریت کے کیمرہ آپریٹر کا اچانک انتقال ہو گیا۔ان کا نو عمر بیٹا اور جوان بیٹی یک لخت یتیم ہو گئے۔حریت کے عملے نے ان کے بیٹے کی تعلیم کے اخراجات اٹھانے کا وعدہ کیا (جو وفا نہ ہو سکا) البتہ طاہر شاہ صاحب نے ان کی بیٹی سے نکاح کی پیشکش کی جو لڑکی کی ماں نے قبول کر لی۔اس طرح یتیم لڑکی اپنے گھر کی ہوئی۔

طاہر شاہ اپنی نوجوانی کے دنوں کا ایک قصہ سنایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ پنجاب کے کسی گاؤں جانے کے لیے کھیتوں کی ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔اچانک دیکھا کہ آگے آگے ایک عورت چلی جا رہی ہے۔اس کی رفتار سست تھی۔شاہ صاحب اس کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ اس کے پیر پیچھے کی جانب تھے۔ وہ پچھل پائی گھومی اور شاہ صاحب سے لپٹ گئی۔شاہ صاحب وہیں غش کھا کر گر پڑے اور تیز بخار کی حالت میں اسپتال پہنچائے گئے۔اب جہاں بھی ہوں، دعا ہے کہ ہر بلا سے محفوظ ہوں۔

اب آگے سنیے۔اسی دوران وہ خط آ گیا جس کا انتظار تھا۔

برٹش کونسل لندن اور ٹامسن فاؤنڈیشن، کارڈف (ویلز) نے مجھے لکھا کہ آپ کا وظیفہ منظور ہو گیا ہے، فلاں تاریخ سے کلاسیں شروع ہو رہی ہیں، اپنا طیارے کا ٹکٹ خریدیں اور لندن پہنچئے۔

اس ٹکٹ خریدنے والی بات نے جان نکال لی۔ حریت کے دکھ بھرے دنوں میں بس اتنا ہی پس انداز کیا تھا کہ کراچی سے مثال کے طور پر ٹنڈو آدم تک جا سکتا تھا۔ وظیفے سے میں تو یہ سمجھتا تھا کہ سارا خرچ وظیفہ دینے والے اٹھاتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ مختلف تھا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ کراچی میں برطانوی سفارتکاروں سے ملو۔ شاید وہ کوئی حل نکالیں۔

مجھے یاد ہے وہ مسٹر ٹائپ تھے۔ انہوں نے بڑے تحمل سے میری کتھا سنی اور بولے کہ تم تو حکومتِ پاکستان کے اخبار کے ملازم ہو۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس بات پر نادم اور شرمندہ ہونا چاہیے۔ میں نے سر جھکا کر کہا ''جی ہاں۔'' وہ بولے کہ سرکاری ملازموں کا سفرخرچ برطانیہ کی سرکار ادا کرتی ہے۔ میں ابھی لندن والوں کو ٹیلیکس بھیج کر پوری صورتحال بتاتا ہوں۔ وہ بتائی گئی۔ ذرا دیر میں جواب دیا۔ ''مسٹر عابدی سے کہو کہ برطانوی ایئر لائن کے دفتر جا کر اپنا ٹکٹ لے لیں۔''

---------O---------

دوسری ہی دنیا

میں ایک مختلف دنیا سے اڑا اور ایک مختلف دنیا میں اترا۔

لندن کے ہوائی اڈے پر ایک خاتون کھڑی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا اور کہا کہ جنوری 1968ء کا مہینہ ہے، تمہیں زیادہ سردی تو نہیں لگ رہی۔ میں کراچی کے لنڈا بازار سے ایک بھاری بھرکم کوٹ لے گیا تھا، اس لیے سردی سے بچا رہا۔ خاتون بولیں کہ تمہارے کورس کے کچھ اور ساتھی بھی آ گئے ہیں، تم سب کو کارڈف جانا ہے۔ فی الحال میں تم سب کو تمہارے ہوٹل لے چلتی ہوں۔ لو یہ لفافہ سنبھالو۔

ہوٹل جا کر میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں شہر کارڈف کی ذرا ذرا سی تفصیل اور ہوائی فوٹو، برطانیہ کے بارے میں تمام بنیادی معلومات، گھر خط لکھنے کے لیے ہوائی ڈاک کا پہلے سے ٹکٹ لگا ہوا ایک لفافہ اور پہلے ہفتے کا میرا جیب خرچ احتیاط سے رکھا تھا۔

میں کیسی دنیا سے چلا تھا، کیسی دنیا میں آ گیا۔

دنیا کے بیسیوں اخباروں اور رسالوں کے مالک لارڈ ٹامسن نے ترقی پذیر ملکوں کے صحافیوں کی تربیت کے لیے برطانیہ میں ویلز کے صدر مقام کارڈف میں ایک تربیتی ادارہ قائم کیا تھا۔ یہ بات چالیس برس پہلے کی ہے۔ یہ فاؤنڈیشن آج بھی قائم ہے اور دنیا بھر کے اخبار نویسوں، ٹیلی ویژن، فلم اور ریڈیو والوں کو تربیت دیتی ہے۔

جب میں صحافت کی تربیت کے لیے وہاں گیا، اسے قائم ہوئے پانچ برس ہوئے تھے اور یہ اُس کا بارہواں کورس تھا۔

میں بہت ڈرتے ڈرتے گیا کیونکہ میرا تعلق اردو زبان اور اردو صحافت سے تھا جب کہ وہاں سارا کام انگریزی میں ہونا تھا۔ انگریزی میں لیکچر سننے تھے، انگریزی مباحثوں میں حصہ لینا تھا اور سب سے مشکل کام یہ تھا کہ خبریں، مضامین، فیچر اور اخبار میں خالی جگہوں کو بھرنے والے چٹکلے بھی انگریزی میں لکھنے تھے۔

خوف بھی تھا اور اندر سے کوئی یہ بھی کہے جا رہا تھا کہ رام بھلی کرے گا۔

وہ اُس نے کی۔

انگلستان والے بھی بڑے چنٹ ہوتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً بارہ ملکوں سے آئے ہوئے رنگ رنگ اور بھانت بھانت کے صحافیوں کو ایک روز بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ یہ کوئی استاد اور طالب علم والی درسگاہ ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں پہلی بات یہ بتائی گئی کہ ہم جو لوگ بظاہر استاد نظر آ رہے ہیں، براہ کرم ہمیں سر کہہ کر نہ مخاطب کیا جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب دو چار روز میں دوست ہو گئے اور یہ بھی ہوا کہ جب کبھی ہم لوگوں سے مشورے مانگے گئے تو انہوں نے یوں سنے جیسے ہم استاد اور وہ شاگرد ہوں۔

اس سے پہلے ہم سب کو کارڈف سے پانچ چھ میل دور پینارتھ نامی گاؤں کے انٹرنیشنل ہاؤس میں ایک ایک کمرہ دیا گیا۔ سردیوں کے خیال سے تازہ تازہ ڈرائی کلین کیا ہوا ایک ایک گرم ڈفل کوٹ دیا گیا جس میں ایک ہڈ بھی سر اور کانوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ پھر فاؤنڈیشن کی عمارت کے نیچے واقع بینک میں ہم سب کے اکاؤنٹ کھولے گئے جہاں سے ہر ایک کو ہر ہفتہ پانچ پاؤنڈ جیب خرچ ملتا تھا۔ رات کا کھانا ہاسٹل میں ملتا تھا البتہ دوپہر کا کھانا وقفے کے دوران ایک مقامی اخبار کے اعلیٰ ملازموں والے کلب میں دیا جاتا تھا۔

اس سارے عمل کا سب سے دلچسپ حصہ وہ تھا جب پہلے دو چار روز میں ہم خیال لوگوں میں دوستیاں ہوئیں اور ٹولیاں بن گئیں۔ میرے ساتھ حیدرآباد، سندھ سے آئے ہوئے اے پی پی کے مرزا، بمبئی کے اوم کمار جوشی، سوڈان کے محمود اور افغانستان کے پردیس اور ایسے ہی دو چار افراد اور بھی اکٹھے ہو گئے اور اچانک یہ ہوا کہ ہم سب کی طالب علمی کی عمر لوٹ آئی۔ ہم نے زندگی سے لطف اٹھانا شروع کیا اور پھر ایک روز بھی چین سے نہیں بیٹھے۔

او کے جوشی کمال کا صحافی تھا۔ اُسے ان گنت لطیفے یاد تھے۔ ہندوستان کے کھانے کو ترستا تھا۔ کلب میں اگرچہ نہایت عمدہ کھانا ملتا تھا لیکن سارا کا سارا ولایتی ہوتا تھا۔ جوشی نے کلب

والوں سے کہا کہ ہم جو مشرق کے لوگ ہیں، اگر ہمارے کھانے میں مرچیں نہ ہوں تو خون میں سفید خلیے بننے بند ہو جاتے ہیں۔ بیچارے کلب والے یہ سن کر لرز گئے، لہٰذا وہ ہر روز کھانے کی میز پر ڈھیر ساری ہری مرچیں رکھنے لگے۔ اب منظر یہ ہوتا تھا کہ ہم ایک ہاتھ سے اسکاٹ لینڈ کی گائے کے گوشت کا اسٹیک اور دوسرے ہاتھ سے ہری مرچیں کچر کچر کھاتے جاتے تھے۔

کلب میں تو یوں کام چل گیا۔ ہاسٹل میں رات کا کھانا دشوار مسئلہ ثابت ہوا۔ کمبخت ذرا سے گوشت کے پارچے اور وہ بھی ٹھنڈے اور اس کے ساتھ ہری پتیوں والی سلاد تھما دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمارے پیٹ بھر گئے۔ جب بھوک کے مارے رات کی نیندیں اڑ گئیں تو ہم سب سر جوڑ کر بیٹھے اور طے یہ پایا کہ ہاسٹل کی بالائی منزل میں چھوٹا سا باورچی خانہ ہے کیوں نہ اس میں سبزی ترکاری پکائی جائے۔ فوراً ہی مسالے خریدے گئے۔ تھیلا بھر کر آلو لے آئے اور میں نے اپنی غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر شام نئے انداز سے آلو کی بھجیا پکانی شروع کی۔ جوشی تو کھاتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اتنی مزے کی ترکاری میں نے کبھی نہیں کھائی۔ ابھی اس عمل کو آٹھ دس روز گزرے تھے کہ ہاسٹل والوں نے ہاتھ جوڑ لیے اور کہا کہ بجلی اتنی زیادہ اور اتنی تیزی سے خرچ ہو رہی ہے کہ ہاسٹل اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بالائی منزل کا کچن کھانا گرم کرنے کے لیے ہے، آٹھ آٹھ آدمیوں کا کھانا پکانے کے لیے نہیں۔

او کے جوشی کے خون میں سفید خلیے بننے بند ہو گئے۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے اس کا حل نکال لیا اور گاؤں کے جن لوگوں سے ہماری دوستیاں ہو گئی تھیں۔ جوشی نے انہیں پٹی پڑھائی کہ تم کہو تو ہم شام کو تمہارے گھر آ کر ہندوستانی کھانا پکا دیا کریں۔ وہ جھٹ مان گئے اور یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم طرح طرح کی سبزیاں پکاتے اور دو حصوں میں پکاتے۔ ایک میں اپنے لیے مرچیں جھونکتے اور دوسرے حصے میں مرچیں برائے نام ڈالتے۔ مگر پھر عجیب تماشا ہوا۔ ہمارے ویلز کے دوست ہمارے حصے کی بھجیا زیادہ شوق سے کھاتے اور پھیکی سبزی کو چھوڑ دیتے۔ آخر سب کے لیے یکساں مرچوں والا کھانا پکنے لگا اور اوم کمار جوشی کے رخسار دوبارہ سرخ نظر آنے لگے۔

ہمارے سوڈانی دوست محمود نے ہندوستانی گالیاں سیکھ لیں۔ شام کو جب ہم گاؤں میں گھومنے نکلتے اور کسی گوشے میں بوس و کنار میں مصروف لڑکے لڑکیاں ملتے تو محمود انہیں ہندوستانی گالیاں دیتا۔ رات کو ہمارے ہوسٹل کے نیچے آ کر کچھ کاریں کھڑی ہو جاتیں جن میں محبت کرنے والے جوڑے بیٹھے ہوتے تھے۔ ہم اوپر اپنی کھڑکیوں سے ان کی کار کی چھت پر چھوٹے چھوٹے

کنکر پھینکا کرتے۔

کارڈف میں ہر اتوار کو ایک ہندوستانی فلم لگتی تھی۔ ہم سب ہندوستانی، پاکستانی، سوڈانی، افغانی اور کوریائی وہ فلم دیکھنے جاتے اور رونے والے مناظر پر ہم سب اپنی اپنی زبان میں آہ وبکا کیا کرتے تھے۔ واپسی میں ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ میں بھنڈی اور چپاتی کھاتے اور اُس روز کی فلم کے گانے گاتے ہوئے ہاسٹل واپس آجاتے۔

اوم کمار جوشی کو بس ایک غم کھائے جاتا تھا اور وہ یہ کہ یہاں کے مرد اور عورتیں اتنی جلدی اور آسانی سے دوستیاں کیسے کر لیتے ہیں۔ ایک شام ہم سب بس میں بیٹھ کر اپنے ہاسٹل جارہے تھے۔ میرے برابر والی نشست خالی تھی۔ اتنے میں ایک لڑکی آ کر اس طرح بیٹھی کہ اُس کی ران میری ران سے چھو رہی تھی اور اس کے بدن کی گرمی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی اس شانِ بے نیازی سے بیٹھی کہ جیسے کوئی بات نہیں اور میرا یہ حال کہ سارے شرعی احکام ایک ایک کر کے یاد آنے لگے اور میں اپنے کونے میں سکڑ گیا۔

نہ ہوئے مستنصر حسین تارڑ۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ ساری مستیاں ایک طرف، کلاس روم میں ہم سب اپنے کام میں سنجیدہ تھے۔ اخبار نویسی اور اخبار سازی کے فن پر بات ہوتی تو ہر چند کہ دلچسپ انداز میں ہوتی، ہم سب برابر سے حصہ لیتے سوائے افغانستان کے مسٹر پردیس کے جو کابل میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور حکومت افغانستان نے انہیں خاص طور پر برطانیہ بھیجا تھا جہاں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ برطانیہ سے کچھ سیکھ رہے تھے یا برطانیہ ان سے کچھ سیکھ رہا تھا۔

ایک روز اخبار سازی پر لیکچر ہوا۔ اخبار کا صفحہ کیسے مرتب کیا جائے، اس پر طویل گفتگو کے بعد ہم سب کو اخبار کا ایک سادہ صفحہ دیا گیا اور کہا گیا کہ اس پر صفحہ اول کا نقشہ بناؤ۔ اپنی تو عمر یہی کرتے کرتے کٹی تھی، میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر سادہ ورق کا غور سے مشاہدہ کیا اور پھر سرخیوں کے مقامات طے کر کے پہلے صفحے کا ڈیزائن تیار کر دیا۔ ہمارے استاد خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

مجھے سب سے زیادہ نمبر ملے۔

ٹامسن فاؤنڈیشن کے جس کورس میں ہم شریک تھے، یہ فاؤنڈیشن کا بارہواں کورس تھا۔ ہر کورس کے طالب علموں کو تین مہینوں کی تربیت کے دوران ایک اخبار ترتیب دینا ہوتا تھا۔

اس کی تیاری شروع ہوگئی۔ ایک لیکچرر ہمارے ایڈیٹر بنے اور ایڈیٹوریل مشاورت شروع ہوئی۔ ہر ایک سے پوچھا گیا کہ تم اخبار کے لیے کیا کرسکتے ہو۔ میں نے پورا دفتر کھول دیا۔ میں نے کہا کہ برطانیہ میں آباد کچھ پاکستانی فلم ساز وسطی انگلستان میں ایک ملی جلی اردو انگریزی فلم بنا رہے ہیں، میں اس کی رپورٹ لکھوں گا۔ اس کے علاوہ میں برمنگھم جاؤں گا اور وہاں آباد پاکستانیوں سے پوچھوں گا کہ ان کا کیا خیال ہے، باقی عمر برطانیہ ہی میں گزاریں گے یا واپس پاکستان جائیں گے۔ (اس وقت پاکستان متحدہ تھا) ساتھ ہی وہاں تارکین وطن کی تصویریں اتار کر لاؤں گا۔ یہ سن کر ہمارے ایڈیٹر خوشی سے اچھل پڑے۔ مجھے برمنگھم جانے کے لیے ضروری رقم دے دی گئی اور سارے عملے نے کامیابی اور اچھی اچھی رپورٹیں لانے کی دعا دی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب روز نامہ جنگ کے میرے ساتھی حبیب الرحمان برمنگھم جا کر وہاں آباد ہو گئے تھے اور وہاں سے اردو کا ہفت روزہ ایشیا نکال رہے تھے جس کے لیے میں کراچی سے خبریں اور تصویریں بھیجتا رہتا تھا۔

میں نے اپنا تھیلا اٹھایا اور ریل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے کنارے سے لگی لگی ٹرین چلی تو نظاروں پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ برمنگھم برطانیہ میں لندن کے بعد دوسرا بڑا شہر تھا جس میں تھوڑے سفید فام اور باقی اپنی طرف کے لوگ آباد تھے۔ یوں سمجھیے کہ ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ کس علاقے میں زیادہ پاکستانی آباد ہیں، کہنے لگے کہ کس علاقے میں زیادہ پاکستانی آباد نہیں ہیں۔

میں جاتے ہی اپنے کام میں جٹ گیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں سے میں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا آپ باقی عمر برطانیہ ہی میں گزاریں گے؟

سب نے ایک ہی جواب دیا ''جی نہیں۔''

بس، اخباری اصطلاح میں مجھے اسٹوری مل گئی۔ میں نے کچھ لوگوں کے چہروں کی تصویریں اتاریں، کچھ پاکستانی دکانوں کے فوٹو لیے اور ایک تصویر سڑک پار کرتی ہوئی برقع پوش خواتین کی ایک ٹولی کی اتاری جن کے پس منظر میں ٹریفک کا سائن بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا No Waiting یعنی یہاں رکنے کی اجازت نہیں۔

ادھر اردو انگلش فلم بنانے والوں نے بے شمار معلومات اور اداکاروں کی تصویریں فراہم کردیں۔ میں نے دونوں رپورٹیں اپنے ٹائپ رائٹر پر لکھیں اور ایڈیٹر کے حوالے کردیں۔ اس

کے علاوہ درس گاہ میں آئے دن جو لطیفے ہوتے تھے، وہ بھی مزے لے لے کر لکھ ڈالے۔

میری ساری تحریریں اشاعت کے لیے منظور ہو گئیں۔ یہی نہیں، ان میں ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا گیا اور میرے اساتذہ نے مجھے خطاب دیا Our Deceptive Reporter۔ اس کا میرے ہندوستانی، پاکستانی دوستوں نے ترجمہ کیا: دیکھنے میں بھولے ہو پر ہو بڑے چنچل۔

یہ بہت کمال کے تین مہینے تھے جن میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دنیا دیکھی اور میری آنکھیں کھلیں۔ ہمیں برطانوی زندگی کے مختلف پہلو، انداز اور ادارے دکھائے گئے۔ شہر کا بڑا اخبار کیسے تیار ہوتا ہے، وہ دکھایا گیا۔ واپسی میں ہمیں لندن لے جا کر شہر کی سیر کرائی گئی۔ اُسی سیر کے دوران میں نے بش ہاؤس دیکھا جہاں سے نشر ہونے والے بی بی سی کے اردو پروگرام ہم باقاعدگی سے سنتے آئے تھے اور جسے دیکھتے ہوئے ایک لمحے کو یہ خیال میرے ذہن میں کوندا تھا کہ اگر یہاں آ کر پڑاؤ ڈال دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ اس وقت میرا ذہن صرف سوال کر کے رہ گیا۔ کوئی جواب نہ زمین سے پھوٹا، نہ عرش سے اُترا۔

ہمارے کورس میں ایک کے سوا سب لڑکے تھے۔ اُس ایک لڑکی پر کبھی کبھی فساد ہوا اور کورس دو ٹکڑیوں میں بھی بٹا لیکن وہ عجب بے لطف، بے مزہ تصادم تھا۔

واپسی کے دن قریب آنے لگے تو کچھ لڑکوں کو ایک دلچسپ راہ سوجھی۔ طے یہ ہوا کہ واپسی کا سفر کیوں نہ یورپ کے راستے کیا جائے اور ان ملکوں کو لکھا جائے کہ ہم صحافی ہیں اور تمہارا ملک دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیسے اچھے دن تھے۔ ہوائی ٹکٹ میں اجازت تھی کہ راستے میں جہاں چاہیں رکیں اور پاکستانی پاسپورٹ رکھنے والوں کے لیے کوئی ویزا کی پابندی نہیں تھی۔ اسپین کے سوا ہر ملک کی سرحدیں پاکستانیوں کے لیے کھلی ہوئی تھیں۔ اوپر کا جملہ دوبارہ لکھنے کو جی چاہتا ہے: کیسے اچھے دن تھے۔

میں نے ہالینڈ، فرانس، جرمنی اور سوئٹزر لینڈ کی حکومتوں کو خط لکھے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ چند روز لگے۔ سب کے جواب آ گئے۔ تشریف لائیے، ہمارا مہمانداری کا ادارہ آپ کا انتظار کرے گا اور یہ بھی بتا دیجیے کہ یہاں آ کر آپ کیا کیا دیکھنا پسند کریں گے؟ ہم دوڑتے ہوئے قریبی ٹریول ایجنٹ کے پاس گئے اور ان ملکوں نے سیاحوں کے لیے جو خوبصورت تصویری کتابچے چھاپے تھے، وہ اٹھا لائے اور تصویریں دیکھ دیکھ کر اپنے من پسند مقامات کی فہرستیں بنا کر بھیج دیں۔ وہ بھی ہمیں ایک ایک ٹھکانا جھنکانے کی ٹھانے بیٹھے تھے۔

یہ سب ہو رہا تھا کہ ہماری ٹولی نے محسوس کیا کہ اوم کمار جوشی غائب رہنے لگا ہے۔ نہ ہمارے ساتھ سبزی ترکاری کھانے آتا ہے اور نہ شام کو گاؤں کے بند پڑے ہوئے بازاروں میں گھومنے اور نہ محمود کی طرح بوس و کنار کرنے والے جوڑوں کو ہندی گالیاں دینے آتا ہے۔

ایک دن کہنے لگا کہ یہ ہندی گالیاں کیا ہوتی ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہمارے سارے حروف عربی فارسی کے ہیں۔ بعد میں ان میں ہندی آوازوں والے جتنے حروف شامل ہوئے ہیں، تمام بے ہودہ گالیوں میں وہ حروف ضرور شامل ہوتے ہیں۔ کہنے لگا کہ اچھا کوئی اردو گالی بتاؤ۔

وہ اس روز ہم نے بتائی۔ پتا یہ چلا کہ بوس و کنار کرنے والے جن جوڑوں کو دیکھ جوشی صاحب لکڑی کی طرح جل کر کوئلہ ہوئے جاتے تھے، اُس قسم کی لڑکیوں سے کہیں علیحدگی میں یہ کہہ بیٹھے کہ میں مشرق سے آیا ہوا ہندو پنڈت ہوں اور نہ صرف تمہاری جنم پتری بنا سکتا ہوں بلکہ تمہاری ہتھیلی دیکھ کر چاہوں تو عمر بھر کا حال بتا دوں۔

غضب ہو گیا۔ انٹرنیشنل ہاؤس میں ٹھہری ہوئی خدا جانے کہاں کہاں کی لڑکیاں جوشی کے کمرے کے باہر قطار بنا کر کھڑی ہو گئیں اور اُن کے سامنے اپنی ہتھیلیاں وغیرہ پھیلا دیں۔ گاؤں کی لڑکیوں کو خبر ملی کہ وہاں ہندو جیوتشی آیا ہے تو وہ بھی وقت مانگنے لگیں۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ جوشی کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ میری مراد ہے اُن کا اپنا سر۔

ایک دن ہم چھ سات کی ٹولی آرام گاہ میں بیٹھی تھی کہ جوشی دو لڑکیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

میں نے اور مرزا نے کہا ''جوشی، اردو گالی سنو گے؟''

بولا ''سناؤ''

ہم نے بیک آواز کہا ''حرام زادے۔''

---------O---------

راہ میں پھول پڑے

گاؤں کے لوگوں نے ہاتھ ہلا کے ہمیں اور ہوسٹل کی لڑکیوں نے آنسو بہا کے جوشی کو رخصت کیا۔ ایک کوچ میں بھر کے ہم سب کارڈف کے اسٹیشن پر پہنچے اور ریل کے ایک ڈبے میں بھر کر لندن روانہ ہوئے۔ راستے بھر ہم نے قوالی کے انداز میں اردو اور انگریزی گانے گائے اور ویلز کے دوست نواز علاقے کو پیچھے چھوڑ کر اکڑی ہوئی گردن والے انگلستان میں داخل ہوئے۔

ہمیں لندن کی سیر کرائی گئی اور ہم نے ٹریفالگر اسکوائر کے حوض میں سکے ڈالے۔ بعد میں پانی کی تہ سے یہ سکے بٹور کر لے جانے والوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ جو مسافر یہاں سکے ڈالتا ہے، وہ ایک بار پھر لندن ضرور آتا ہے۔

ہمیں اندازہ نہ تھا کہ کم بختوں کی اڑائی ہوئی افواہ کچھ اتنی افواہ بھی نہیں تھی۔

میں نے یورپ کے اپنے سفر میں جو ہزار باتیں سیکھیں اس میں سرفہرست یہ تھی کہ وہ لوگ صحافیوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ وہ کیسے اچھے دن تھے جب پاکستانیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور تو اور سوئٹزرلینڈ میں بینک نے پاکستانی کرنسی بھی قبول کر لی۔ ویزا کہیں نہیں مانگا گیا اور پاسپورٹ پر ٹھپہ لگاتے ہوئے یہ ضرور کہا گیا کہ خوش آمدید، امید ہے آپ یہاں اپنے قیام سے لطف اندوز ہوں گے۔

میں سمندری جہاز کے ذریعے ہالینڈ کے لیے روانہ ہوا۔ یہ رات بھر کا سفر تھا، سونے کے لیے ہر کیبن میں چار چار مسافر ٹھہرائے گئے۔ میرے کیبن میں تین سفید فام نوجوان تھے جو مجھے دیکھتے ہی پیچھے ہٹ گئے اور مجھ سے کہا کہ پہلے آپ اپنے لیے بستر کا انتخاب کر لیجیے۔ کتنی

چھوٹی سی بات تھی مگر تقریباً 45 سال بعد آج بھی یاد ہے۔ ہالینڈ کی بندرگاہ سے ٹرین لے کر میں ایمسٹرڈیم کے اسٹیشن پر پہنچا۔ صبح ہو گئی تھی اور میں شیو بنانا چاہتا تھا۔ اسٹیشن کے عملے نے مجھے غسل خانے کی راہ دکھائی جو اتنا صاف، اتنا زیادہ صاف تھا کہ مجھے پورے وقت یہ فکر رہی کہ کہیں گندا نہ ہو جائے۔

وہاں سے میں ہالینڈ کے اس ادارے میں پہنچا جو میرا میزبان تھا۔ ساڑھے چھ فٹ لمبے ایک اعلیٰ افسر میرا انتظار کر رہے تھے کیونکہ تین دن میری دیکھ بھال اُن ہی کے ذمے تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے کچھ رقم دی اور کہا کہ یہ تمہارے قیام کا خرچ ہے اور اتنی رقم دے کر تم مہنگے ہوٹل میں رہ سکتے ہو مگر میں تمہیں ارزاں پنشیوں (یعنی گیسٹ ہاؤس) میں لے چلتا ہوں جو نہایت صاف ستھرا ہے۔ وہاں مزے سے سویا کرو، دن میرے ساتھ گزارو اور باقی رقم اپنے اوپر خرچ کرو۔

اس کے بعد اس فرشتہ صفت ولندیزی نے مجھے وہ ایک ایک جگہ دکھائی جو میں نے سیاحوں کے کتابچے کو دیکھ کر لکھ بھیجی تھی۔ میں پھولوں کے وہ کھیت دیکھنا چاہتا تھا جو وہاں تک پھیلے ہوئے تھے جہاں آسمان زمین سے ملتا ہے اور جن کے بیچ پن چکیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اُس شخص نے پھولوں کے وہ تختے دکھائے جنہیں دیکھ کر مجھے قرآن کی وہ آیت رہ رہ کر یاد آئی جس کا مطلب ہے کہ خدا حسین ہے اور حسن کو پسند کرتا ہے۔

سوچیے، میں نے کیا دیکھا۔

اچھے لوگ تھے۔ سارے کے سارے دراز قد، شاید اس لیے کہ ان کے ملک کا بڑا حصہ سطح سمندر سے نیچا ہے۔ جیسے ہماری طرف غسل کے وقت لکڑی کی کھڑاویں پہنی جاتی ہے، یہ لوگ گھر میں لکڑی میں تراشے ہوئے جوتے پہنتے ہیں۔ شاید انہیں خوف ہے کہ خدا جانے کب سمندر ان کے گھروں میں داخل ہو جائے۔ ان سے بات کرنا آسان تھا، وہ سب انگریزی بولتے تھے۔

ہالینڈ کے بعد میں پیرس گیا اور اُس دفتر میں پہنچا جو میرا میزبان تھا۔ وہاں صرف خواتین کام کر رہی تھیں اور ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران ہماری طرف کی عورتوں کی طرح اوئی اوئی کہتی جا رہی تھیں۔ بس ناک پر انگلی رکھنے کی کمی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ فرانسیسی زبان میں ہاں کو اوئی کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وہاں جب دلہن سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہیں یہ رشتہ منظور ہے تو وہ آہستہ سے اوئی کہتی ہوگی۔ کتنا رومانٹک تصور ہے۔

ان لوگوں نے میرے قیام کے لیے ہوٹل کے کاغذات اور پیرس شہر کی سیر کرانے والی بسوں اور کشتیوں کے ٹکٹ دے دیئے اور کہا کہ جاؤ۔ اب یہ شہر تمہارا ہے۔ ایسے تاریخی اور اتنے شاندار شہر میں گھومتے ہوئے یوں لگا جیسے کسی بہت کشادہ محل میں گھوم رہا ہوں۔ دن کے وقت اس کا حسن مختلف تھا اور رات کے وقت جدا۔ بس یہ ہے کہ فرانس والے انگریزی بولنے سے انکاری تھے۔

اس کے بعد میری راہ میں جرمنی تھا۔ وہ تو غضب کے مہمان نواز نکلے۔ اُن کے ہاں مہمان داری کا ایک بڑا ادارہ ہے جن کے پاس یونیورسٹی کے رضا کار طالب علموں کی بڑی فہرست ہے۔ ان کا ہر مہمان ایک طالب علم کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو ان کے پورے قیام کے دوران اُن کی خاطر مدارات کرتا ہے۔

میں نے جس دوسری عالمی جنگ کے دوران ہوش سنبھالا تھا، اُس جنگ میں بننے والے کتنے ہی کھنڈر ابھی تک جوں کے توں کھڑے تھے تا کہ اُس تباہ کاری کو دنیا بھول نہ جائے۔ جرمن باشندے جو کبھی ہٹلر کے فوجی بن گئے تھے، آج بھی ویسے ہی نظم وضبط کے عادی ہیں۔ اپنے کام سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ مسکرا دیتے ہیں، قہقہہ نہیں لگاتے۔ ڈسل ڈورف کے ایک بازار میں اپنے میزبان سے باتیں کرتے کرتے میں جو زور سے ہنسا تو سارے راہگیروں نے مڑ کر دیکھا۔

میں خاص طور پر برلن گیا۔ میں دیوار برلن دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے دکھائی گئی اور اس اونچے مچان پر چڑھایا گیا جہاں سے دیوار کی دوسری طرف شہر کا کمیونسٹ علاقہ نظر آتا تھا۔ عجب بے رونقی تھی۔ بس ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ میرے دورے کے بیس سال بعد دونوں طرف کے لوگوں نے مل کر یہ دیوار گرادی۔

مجھے اس وزارت کا دورہ کرایا گیا جو مشرقی اور مغربی جرمنی کے اتحاد کے نام پر قائم کی گئی تھی۔ میں کچھ کشمیر کی صورتحال ذہن میں لے کر وہاں گیا اور گفتگو کے دوران ان سے پوچھا کہ بٹوارے کی نذر ہو جانے والے ملک کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں۔ جواب ملا کہ ہم اپنی آواز بلند کرتے رہتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس صبر کے نتیجے میں ملک دوبارہ ایک ہو جائے گا۔ 3 اکتوبر 1990ء کو اس قوم کو اپنے صبر کا پھل مل گیا جو یقیناً میٹھا ہوگا۔

میں جرمن ریڈیو دیکھنے کولون بھی گیا۔ وہاں اردو نشریات کے جرمن نگراں بہت گرمجوشی

سے ملے اور چلتے وقت میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے ''اپنی مشرقی روایات کو جیسے بھی بنے بچا کر رکھو۔ مغرب کی روایات سے ہوشیار رہو جو کسی بھی وقت یلغار کر سکتی ہیں۔'' تب پتا چلا کہ یوڈی کولون میں خوشبو پھولوں کی نہیں، باتوں کی ہوتی ہے۔

میرا اگلا پڑاؤ سوئٹزرلینڈ تھا جس کے نظاروں کو ہر سال کے کیلنڈر میں حسرت سے دیکھا کرتا تھا۔ وہاں گیا تو وہ ساری تصویریں جی اٹھیں۔ ذرا دیر میں احساس ہو گیا کہ زمین کا یہ خطہ حسین نہیں، اسے اس کے باسیوں نے اپنے سلیقے اور قرینے سے حسن عطا کیا ہے۔ ہماری جن بالکونیوں میں دُھلے ہوئے کپڑے پھیلا کر سکھائے جاتے ہیں یہاں اُن بالکونیوں، دریچوں اور کھڑکیوں میں پھول اُگائے جاتے ہیں اور پھول بھی ایسے کہ دیکھنے میں یوں لگے جیسے نیچے کو گر رہے ہوں۔

سوئٹزرلینڈ والوں نے مجھے جنیوا کی جھیل کے کنارے سب سے مہنگے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ مجھے اپنی مرضی کا کھانا منگانے کی پوری اجازت تھی۔ شام ہوتے ہی میں بڑی شان سے ہوٹل کے طعام خانے میں گیا اور بیروں سے کہا کہ جو آج کی خصوصی ڈش ہو، وہ لے آؤ۔ وہ خوشی خوشی لینے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈش آئی، خشکے کی چھوٹی سی ڈھیری کے اوپر سور کی ٹانگ رکھی ہوئی تھی۔ پہلے میں نے اپنا سر پیٹا، اس کے بعد بیروں نے مارے شرمندگی کے قریب قریب ہاتھ جوڑ لیے۔ ہوٹل کا منیجر مجھ سے معافی مانگنے آیا اور خانساماں کو حکم دیا کہ میرے لیے بہت عمدہ مچھلی پکائی جائے۔

اُن دنوں اسلام کا نام سن کر لوگ ادب سے آنکھیں جھکا لیا کرتے تھے۔

اپنی غلطی پر دوسروں کو نادم ہوتے میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں سوئٹزرلینڈ والوں کی مہمان نوازی سے لطف اٹھاتا تو کیسے۔ جیب میں پیسے ختم ہونے کو آ رہے تھے۔ جو پاکستانی نوٹ پاس تھے، جنیوا میں وہ بھی قبول کر لیے گئے۔ ابھی مجھے ترکی بھی جانا تھا اور وہ بھی خالی جیبوں کے ساتھ۔

مجھے بخار سا رہنے لگا۔ چکر سے آنے لگے اور سوئٹزرلینڈ اچھا لگنا بند ہو گیا۔ گرتا پڑتا ایئر لائن کے دفتر پہنچا اور دفتر والوں سے کہا کہ مجھے یہاں سے سیدھا کراچی بھجوا سکتے ہو؟ وہ جھٹ راضی ہو گئے۔

میری طبیعت ٹھیک ہو گئی اور اس وقت تو اور بہتر ہو گئی جب میں نے میزبان دفتر سے کہا کہ میری پرواز میں تین دن باقی ہیں تو انہوں نے ہوٹل کو فون کر کے میرا قیام بڑھوا دیا۔ یہ الگ

بات ہے کہ وہ تین دن بڑی مشکل سے کٹے۔ جنیوا کی جھیل کے بیچوں بیچ چلنے والا فوارہ دیکھتے دیکھتے میں تنگ آ گیا اور زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک غیر ملک یعنی ترکی کی سیر سے محروم رہ جانے کا مجھے اتنا سا بھی افسوس نہیں ہوا۔

میں پاکستان لوٹا تو ایک تربیت یافتہ اخبار نویس اور ایک اناڑی سفر نامہ نگار بن کر۔ روزنامہ حریت میں دس بارہ قسطوں میں میرا سفر نامہ شائع ہوا جس پر میں اتنا ہی نادم ہوں جتنا جنیوا کے طعام خانے والے ممنوع کھانا پیش کرنے پر ہوئے تھے کیونکہ میں نے اپنے سفر نامے میں وہ ساری باتیں لکھیں جو اناڑی مسافروں کو نئی نئی اور عجیب عجیب لگتی ہیں۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ دلّی کے ایک ڈائجسٹ نے میرا پورا سفر نامہ شائع کیا اور مجھ پر ایک کرم بھی کیا۔ مصنف کی جگہ میرے بجائے کسی انگریز یا امریکی کا نام لکھ دیا۔ شکر ہے کہ قارئین کے سارے کوسنے کاٹنے اسی پیٹر یا ہیری کے کھاتے میں گئے ہوں گے۔

البتہ کراچی میں سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانے نے مجھے خط لکھ کر میرا شکریہ ادا کیا۔ مجھے کھانے پر بلایا اور بتایا کہ میری تحریر کا ترجمہ کرا کے سوئٹزرلینڈ بھیجا گیا ہے کیونکہ اس سے ہمارے ملک کو شہرت ملی ہے۔

میں نے فوراً ہی ان کا شکریہ قبول کیا۔

اب میں جو صحافت کے دریا میں دوبارہ غوطہ زن ہوا تو یہاں بہت کچھ بدل چکا تھا اور بہت کچھ بدلنے والا تھا۔

پتا چلا کہ میرے دونوں دوست فرہاد زیدی اور ثناء اللہ روزنامہ مشرق چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ دوسری بڑی خبر یہ تھی کہ روزنامہ حریت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو روزنامہ ڈان والوں نے خرید کر اُسے نئی زندگی دے دی ہے اور تیسری بری خبر یہ تھی کہ کم سے کم میرے لیے کہ روزنامہ مشرق کو لاہور کا روپ رنگ دینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

میں نے واپس آ کر حسب معمول نیوز روم کی شہ نشست سنبھال لی اور ڈیسک پر اپنے ساتھیوں کو خبر کا وہ تصور سمجھانا شروع کیا جس کی میں ولایت سے تربیت لے کر آیا تھا۔ ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ پتا چلا کہ ادارے کو برطانوی خطوط پر چلایا جائے گا۔ میں اب نیوز ایڈیٹر نہیں بلکہ سٹی ایڈیٹر کہلاؤں گا۔ ایک الگ کمرے میں بیٹھوں گا اور سارے مقامی رپورٹر میرے ماتحت ہوں گے۔ مجھے الگ بٹھا دیا گیا۔ میری قید تنہائی شروع ہو گئی۔

اقبال زبیری صاحب لاہور سے کراچی آگئے اور انہوں نے ایڈیٹر کے فرائض سنبھال لیے۔ نیوز روم کی سربراہی کے لیے وہ لاہور سے ایک صاحب کو لے آئے جنہیں مجھ سے کوئی غرض نہ تھی اور وہ سیدھے زبیری صاحب کو جوابدہ تھے۔ عمارت میں ایک طرف نیوز روم تھا، دوسرے سرے پر ایڈیٹر کا کمرہ تھا۔ ان دونوں کو ایک راہداری ملاتی تھی۔ اس راہداری میں میرا کمرہ تھا۔ میں وہاں بیٹھا دیکھا کرتا تھا کہ لاہور سے آیا ہوا انچارج ذرا ذرا سی بات پوچھنے دوڑا دوڑا ایڈیٹر کے کمرے میں جاتا ہے۔ وہ تمام وقت بجلی کی طرح لپکتا ہوا آتا اور جاتا رہتا تھا۔ اب رہ گیا سٹی ایڈیٹر، اس کے ماتحت ایک کرائم رپورٹر تھا جو خدا جانے کہاں غائب رہتا تھا اور ایک لاہور سے آئے ہوئے سینئر رپورٹر تھے وہ سیّد زادے شام ہوتے ہی بوتل لنڈھا لیتے تھے اور میرے کمرے میں آ کر کج بحثی کیا کرتے تھے۔

میرے کمرے میں بس وہی چند لمحے ہوتے تھے جب وہاں کچھ رونق ہوتی تھی۔ اسی دوران فرہاد زیدی صاحب کا فون آیا ''حریت میں آ جائیے۔'' میں اٹھا اور حریت میں چلا گیا۔

یہاں میں جس شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا وہ عنایت اللہ صاحب تھے۔ صرف ایک پھیپھڑے پر زندہ تھے مگر زندہ رہنے کی غیر معمولی امنگ پائی تھی۔ جب تک جیے کبھی نہیں تھکے۔ اپنی زندگی اخبار کے لیے وقف کر دی۔ لاہور سے روزنامہ مشرق جاری کیا جس نے دوسرے اخباروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پھر ہفت روزہ اخبار خواتین جاری کیا۔ وہ بھی گھر گھر پہنچا۔ اس کا انداز بھی ہو بہو برطانوی رسالوں جیسا تھا۔

میں جب برطانیہ جانے لگا تو گرمجوشی سے رخصت کیا۔ ان کے ادارے کا یہ دستور تھا کہ عملے کا کوئی رکن کہیں سے آ رہا ہو تو ادارے والے اسے لینے ضرور جاتے تھے۔ البتہ ایک آنے والا مجھے یاد رہے گا۔ وہ تھے عنایت اللہ صاحب کے لندن کے ساتھی رزاق صاحب۔ تیزی ان پر ختم تھی۔ دفتر میں دھوم مچی کہ رزاق صاحب کراچی آ رہے ہیں۔ ہمارے نہایت سرگرم اور مراسم والے رپورٹر ثناء اللہ کو ہوائی اڈے بھیجا گیا کہ رزاق صاحب پی آئی اے سے آ رہے ہیں۔ ذرا انہیں باہر آنے میں مدد دیں۔

ثناء اللہ کو اس شام غیر معمولی مشقت اٹھانی پڑی ہوگی کیونکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے، رزاق صاحب لندن کے مال سے بھرے ہوئے بیس (مجھے خدا جانے کیوں چالیس یاد ہیں) سوٹ کیس لائے تھے۔

عنایت اللہ صاحب نے مجھے گرم جوشی سے رخصت کیا تھا اور اطمینان دلایا تھا کہ میرے بیوی بچوں کا خیال رکھیں گے۔ چنانچہ انہیں (وہی ثناء اللہ کے ہاتھوں) میری تنخواہ پہنچائی گئی۔ میں واپس آیا تو بڑے تپاک سے ملے۔ مگر مجھے مشرق کے لاہوری انداز راس نہ آئے۔ مجھے سٹی ایڈیٹر بنا دیا گیا لیکن عنایت صاحب کو مغالطہ ہوا۔ سٹی ایڈیٹر شہر کی خبروں کا نہیں، شہر کے ایڈیشن کا ذمہ دار اور نگران ہوتا ہے۔ ان دنوں ویت نام میں امریکی فوجی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ تو کیا ایسے میں سٹی ایڈیٹر کو گھر بٹھا دیا جاتا ہے۔

میں کام کرتے کرتے عملاً فارغ ہو گیا۔ مجھے اس کا رنج نہیں تھا کہ میں عضوِ معطل ہو گیا ہوں۔ مجھے اس کی فکر تھی کہ جن قارئین کو اخبار جنگ پڑھنے کی عادت ہے، وہ برطانوی طرز کے روزنامے کے گاہک کیسے اور کیونکر بنیں گے۔

میں نے بلند اقبال کے ہاتھوں اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ وہ انہوں نے ڈر کے مارے دفتر کے حوالے نہیں کیا اور مجھے بتایا بھی نہیں۔

اس کا مجھے رنج رہے گا۔

عنایت اللہ صاحب کی ایک اور بات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ رات جس وقت اخبار کے آخری صفحے مکمل ہو جاتے تھے تو انہیں پریس بھیجنے سے پہلے ان پر آخری نگاہ ڈالی جاتی تھی۔ یہ بہت ہی کڑا کام ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ یہ نگاہ واقعی آخری ہوگی۔ صبح جب چھپا ہوا اخبار ہاتھ میں آتا تھا تو اسے جلدی جلدی دیکھا کرتا تھا کہ کہیں کوئی حماقت تو سرزد نہیں ہوئی۔

اس آخری نگاہ ڈالتے وقت عنایت اللہ صاحب کہا کرتے تھے ''اس میں شک ڈالو، شک ڈالو'' مطلب یہ کہ اس وہم میں مبتلا رہیں کہ ہو نہ ہو کہیں کوئی غلطی نکلے گی ضرور۔

وہ کمبخت واقعی نکلتی تھی۔

اس کے دو واقعات فرہاد زیدی نے یاد دلائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں کا تعلق کسی کی علالت سے تھا۔

ایک بار میں اخبار پر آخری نظر ڈال رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک چھوٹی سی خبر پر سرخی لگی ہے جس میں لکھا ہے: علامہ رشید شرابی علیل ہیں۔ رشید ترابی کے نام کا یہ حشر پہلے تو کاتب نے کیا، پھر پروف ریڈر نے کیا۔ آخری عذاب نیوز ایڈیٹر پر نازل ہوا چاہتا تھا کہ غلطی پکڑی گئی ورنہ اگلی صبح اخبار کے دفتر پر دھوئیں اور آگ کی کہاوت صادق آتی۔

ایک مرتبہ اور عجب ایک سانحہ سا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ رات پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ آنکھیں منتظر تھیں کہ کام ختم ہو اور گھر جا کر سوئیں۔ آخری دو صفحات پر کڑی نگاہ ڈالی جا رہی تھی۔ سرخی لگی تھی:

صدر ایوب غلیل ہو گئے۔

اگر یہ خبر یوں ہی چھپ جاتی تو میں اپنی زندگی کا آخری مصرعہ کہتا:

ایک غُلّہ میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اسے میں صحافت یا اخبار نویسی نہیں، اخبار سازی کہتا ہوں کہ یہ کام تنی ہوئی رسی پہ چلنے والی نٹنی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

---------O---------

جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی

حالات جیسے میری ہی راہ تک رہے تھے کہ میں لوٹ کر آؤں تو وہ خراب ہوں۔ اب جو وہ بگڑے تو پھر ملک کو توڑ کر رہے۔

میں ایسے حالات میں ایوب حکومت کا اخبار چھوڑ کر ہارون گھرانے کے اخبار میں ملازم ہوا اور پھر تو ہر رات قتل و غارت گری، گھیراؤ جلاؤ، لوٹ مار، ہڑتال، فائرنگ اور ہلاکتوں کی خبریں لکھتے ہوئے گزری۔

صرف یہی نہیں، اخبار کے دفتر پہنچنے کے لیے کبھی جلتی ہوئی موٹر گاڑیوں کے درمیان سے گزرنا پڑا اور کبھی پتھراؤ سے بچنے کے لیے راستے بدلنے پڑے۔ کبھی ہوائی حملوں کے سائرن سننے پڑے اور کبھی راہ میں رک کر یہ تقریر سننی پڑی کہ اگر اقتدار دینا ہی ہے تو اِدھر ہمیں دو اور اُدھر انہیں دو۔

اس دو دو کی تکرار میں اور تو کچھ نہیں ہوا، ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔

اخبار وہی تھا، عملہ بھی قریب قریب وہی تھا مگر عمارت مختلف تھی۔ ایڈیٹر مختلف تھا اور وسائل کی قلت نہیں تھی۔

ہارون ہاؤس کی بڑی اور کشادہ عمارت میں جہاں انگریزی روزنامہ ڈان، ایوننگ اسٹار اور ڈان گجراتی کے دفتر پہلے سے موجود تھے، حریت کو ایک وسیع نیوز روم، ایک سٹی روم، کاتبوں کا بڑا کمرہ یہاں تک کہ نسوانی عملے کے لیے علیحدہ کمرہ مل گیا۔

نہ صرف تنخواہ باقاعدگی سے ملنے لگی بلکہ مہذب دفتروں میں عملے کو جو مراعات ملتی

چاہئیں، وہ سب مل رہی تھیں۔ پتا چلا کہ باقی عملہ تو صحت مند ہے لیکن کاتب، ان کی بیویاں اوران کے بچے پرانے مریض ہیں۔ اس مجمع نے دفتر کے ڈاکٹر کا گھر دیکھ لیا۔ میرے ہاں تیسرا بچہ پیدا ہوا۔ سارا خرچ دفتر نے ادا کیا۔ اس مرتبہ تفریح ٹیکس نہیں لگا اور ماتری صاحب یاد آئے۔ اس کے علاوہ تنخواہ کے ساتھ پراویڈنٹ فنڈ بھی کہیں جمع ہونے لگا اور میرے بی بی سی لندن چلے جانے کے بعد دفتر نے میری بیوی کو اچھی خاصی رقم دی۔

عملے کی صورتحال یہ تھی کہ جو لوگ بدستور فخر ماتری کے حریت سے وابستہ تھے، ان میں کسی کو بے روزگار نہیں کیا گیا۔ صرف نیّر علوی کے بارے میں سنا کہ انہوں نے ترک تعلق کر لیا ہے۔ سنہ 68ء خاتمے کے قریب تھا جب میں مشرق کو خیر باد کہہ کر حریت سے وابستہ ہوا ہی تھا کہ ایک شام عجب منظر دیکھا۔ نیّر علوی اچانک دفتر میں داخل ہوئے اور خبروں کے پلندے کا معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ بھارتی کشمیر میں شیخ عبداللہ کی نظر بندی سے رہائی اور ان کی تقریر کو شہ سرخی بنایا جائے گا۔ اُس کے بعد انہوں نے کتابت کے لیے سرخی لکھی:

شیر کی ایک ہی چنگھاڑ سے پورا بھارت لرز اٹھا

جتنی دیر انہوں نے یہ کارروائی کی، میں سمٹ کر اپنے گوشے میں بیٹھا سوچتا رہا کہ شاید انہیں مجھ سے اعلیٰ منصب ملا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ حریت کی انتظامیہ کے کسی شخص سے ملنے آئے تھے۔ جاتے جاتے سرخی لگا گئے۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔

حریت میں میرے چند ساتھیوں کے نام رہے جا رہے ہیں۔ نوجوان، ذہین اور ہونہار صحافیوں کی جو کھیپ ہمارے ہاتھ لگی ان میں ایس ایم یعقوب شامل تھے۔ وہ جو نیک اور سعادت مند بچے ہوتے ہیں، سیّد محمد یعقوب ان ہی کی مثال تھے۔ اس کے علاوہ ظفر قریشی بھی تھے۔ یہ دونوں جہاں تک مجھے یاد ہے اخبارِ خواتین سے حریت میں آئے تھے۔ ظفر قریشی تو کچھ کارٹون وغیرہ بھی بنا لیتے تھے۔ کسی مرحلے پر امریکہ جا کر گم ہو گئے۔ یعقوب ماہنامہ رابطہ کے بعد اب ہمدرد سے وابستہ ہیں۔ ساجد علی ساجد بھی محنتی اور خاموش کارکن تھے۔ نظام صدیقی پرانے صحافی تھے۔ چنانچہ ان کی عادتیں بھی پرانی تھیں۔ غضب کی لیڈر شپ اور جہاں تک مجھے یاد ہے صحافت کے بعد ان کی زیادہ دلچسپی یونین یا پریس کلب میں تھی۔

عبدالکریم عابد بھی تھے۔ وہی جماعت اسلامی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ایک بار شہریار جلیس کے ساتھ مل کر خبر لائے کہ پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی صدر سوئیکارنو کی بیوی کی دیکھ

بحال امریکی سی آئی اے کر رہی ہے اور ان کے ہوٹل کے کمرے میں پھول بھی امریکی سفارتخانے نے بھجوائے ہیں۔

حریت میں اس خبر کی اشاعت کے بعد پاکستان کے بے حد عزیز دوست سوئیکارنو کی اہلیہ نے بہت درد بھرا بیان جاری کیا۔

اسی طرح یہ دونوں خبر لائے کہ کراچی کے ہوٹل میٹروپول میں ڈسکو شروع ہو گیا ہے اور نیون سائن میں ڈسکوتھک کا بورڈ بھی لگ گیا اور مغرب کی برہنہ تہذیب، وغیرہ وغیرہ۔

آج کتنے ہی رپورٹروں اور نامہ نگاروں کی بہو بیٹیاں گھر کی شادیوں میں بولی ووڈ جیسے رقص کر رہی ہوں گی اور کسی کو حیرت بھی نہیں ہوگی۔

حریت میں ممنون الرحمان بھی تھے۔ نصر اللہ خان کے قریبی عزیز تھے۔ گمنام تھے، گمنام ہی رہے۔

البتہ شہریار جلیس کے ذکر پر یاد آیا کہ ان کے والد ابراہیم جلیس جو حیدر آباد دکن سے اعلیٰ نثر لکھتے ہوئے آئے تھے اور چالیس کروڑ بھکاری اور جیل کے دن جیل کی راتیں جیسی کتابیں لکھ چکے تھے، کچھ عرصے کے لیے روزنامہ حریت سے بھی وابستہ رہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے زیادہ عرصے نہیں جیے۔ میرے ذہن میں ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ بہت عرصے زندہ رہے گا۔

حریت میں خواتین کا شعبہ بھی تھا۔ یہ پاک و پاکیزہ بیبیاں ہم لوگوں سے ذرا فاصلہ رکھتی تھیں لیکن ان کے ہونے سے ایک فائدہ ضرور تھا کہ مرد حضرات وضع قطع کے معاملے میں اپنا خیال رکھتے۔ اس پردہ داری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتر میں کبھی کوئی اسکینڈل نہیں ہوا لیکن اب کوئی کیا کرے کہ دفتر سے باہر کے معاملات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

ان میں سے ایک خاتون کا ہماری بیگمات سے ملنا جلنا تھا۔ ''ایک عورت ایک کہانی'' کے عنوان سے ان کا قصہ ہمیں معلوم تھا۔ ہوا یہ کہ فوج کے ایک کپتان انہیں دل دے بیٹھے۔ یہاں تک غنیمت تھا۔ جیسے فوج والے دشمن کے علاقے پر قبضہ کرتے ہیں، کپتان صاحب نے ہماری خاتون پر قبضہ کر لیا۔ وہ جادوگر تھے یا شعبدہ باز تھے یا بھوت تھے یا بلا تھے۔ انہیں ایک کمال آتا تھا۔ انہیں خاتون کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ملنا جلنا، کھانا پینا یہاں تک کہ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسے دیکھ کر مسکرائیں اور کسے سلام کیا۔ اوپر سے غضب یہ کہ وہ خاتون کی ہر ہر حرکت پر وضاحت بھی طلب کرتے تھے۔ غرض یہ کہ انہوں نے خاتون کا جینا دوبھر کر دیا۔

پتا چلا کہ فوج کے مخبری کے لوگ ان کے ماتحت تھے۔ انٹیلی جنس والوں کو انہوں نے اس کام پر لگا دیا کہ خاتون پر کڑی نگاہ رکھیں، سو وہ رکھتے تھے۔ پھر اللہ جانے کیا ہوا۔ سنا ہے شادی ہوئی اور فوراً ہی چھٹم چھٹا ہوئی۔

مگر ہم فوجی انٹیلی جنس کی اس اعلیٰ کارکردگی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک دوست نے ہم پر انکشاف کیا کہ یہ لوگ یہ تک بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ریفریجریٹر میں کتنے ٹماٹر ہیں اور ان میں کتنے گلے سڑے ہیں۔ اس پر ہمارے ایک اور دوست نے کہا کہ جی ہاں، یہ لوگ بس یہی بتا سکتے ہیں۔

جس وقت میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں (مئی سنہ 2011ء) ایبٹ آباد میں کسی امریکی کمانڈو کی گولی اُسامہ بن لادن کی بائیں آنکھ کے راستے ان کے دماغ کو چیرتی ہوئی گدّی سے نکل گئی۔ مخبری کرنے والے شاید کسی اور کپتان کی محبوبہ پر کڑی نگاہ رکھنے میں مصروف ہیں۔

ہمارے ایڈیٹر فرہاد زیدی تھے۔ وہ جتنے ہمارے ایڈیٹر تھے۔ اتنے ہی دوست بھی تھے اور ہم دونوں کو پاکستان کے نہایت پرآشوب دور میں صحافت کی ذمہ داریاں نبھانی تھیں۔ مالکان نے زیدی صاحب کو اختیار دیا کہ مخالف اخبار جنگ میں جو بڑے بڑے نامور لوگ لکھ رہے ہیں، ان سب کو زیادہ معاوضے کی پیشکش کر کے حریت میں لے آئیں۔ سب سے پہلے لاہور سے احمد ندیم قاسمی صاحب آئے اور اپنا کالم وہی جنگ والے عنوان "لاہور لاہور ہے" کے تحت لکھ کر کراچی بھیجنے لگے۔

دوسرے ابن انشاء مرحوم تھے جن کے شگفتہ کالم بہت مقبول ہو رہے تھے۔ ان سے بات ہو گئی اور وہ حریت میں آنے کو تھے کہ خدا جانے کیسے ان کا ارادہ بدل گیا۔ قاسمی صاحب بھی کچھ عرصے بعد معذرت کر کے واپس جنگ میں چلے گئے۔

تیسرا بڑا کارنامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ طے یہ پایا کہ جوش ملیح آبادی سے ان کی خودنوشت لکھوائی جائے۔ درمیان میں راغب مرادآبادی پڑے اور فرہاد زیدی خود جوش صاحب سے ملنے گئے اور انہیں تین ہزار روپے ماہانہ کی پیشکش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ زیدی صاحب کے جانے کا اس سے بھی بڑا مقصد جوش صاحب کو یہ سمجھانا تھا کہ گھروں میں پڑھے جانے والے اخباروں کو بعض نزاکتوں اور مصلحتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ جی ہاں، میں خوب سمجھتا ہوں۔

اب ان کا لکھا ہوا پہلا باب آیا جس کا عنوان کچھ یوں تھا کہ میں نے شراب نوشی کیسے شروع کی۔ ابھی یہ شائع نہیں ہوا تھا کہ اگلے ہفتے کے لیے اگلی قسط آ گئی جو کچھ یوں تھی: "میں کب اور کیسے دہریا ہوا......"

جوش صاحب کو آہستگی سے سمجھایا گیا کہ جو کنبے اخبار پڑھتے ہیں، وہ ان تحریروں پر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ اس پر جوش صاحب نے اخبار کو اپنے استعفے کا خط لکھا جو یوں شروع ہوتا تھا: اے میری شرمیلی قوم!

لیکن شاعر انقلاب نے ایک کمال کیا۔ انہوں نے پھر اپنے قلم کو رکنے نہیں دیا اور یادوں کی برات مکمل کر کے چھوڑی۔

سچی جھوٹی جیسی بھی ہے، لاجواب کتاب ہے۔

فرہاد زیدی بے مثال صحافی ہیں۔ ان کا تعلق دکن کے تاریخی شہر اورنگ آباد سے ہے۔ نوعمری ہی سے اخبار نویس ہیں۔ پاکستان آ کر لاہور میں آباد ہوئے اور عنایت اللہ صاحب کے قرب نے ان کے اندر چھپی ہوئی خوبیوں کو ابھارا۔ لاہور کے بعد اخبار مشرق سے وابستہ جن لوگوں نے اخبار کی مثالی ترقی میں ہاتھ بٹایا ان میں مسرت جبیں بھی تھیں جو خانم کی ڈائری کے عنوان سے مستقل کالم لکھتی تھیں۔ ان کا سحر صرف اخبار تک محدود نہ رہا بلکہ فرہاد زیدی پر بھی کام کر گیا۔ اب وہ دونوں دو نہایت ہونہار بیٹوں کے والدین ہیں۔

عنایت اللہ صاحب نے جب کراچی سے خواتین کا نہایت کامیاب ہفت روزہ اخبار خواتین نکالنے کا فیصلہ کیا تو ہراول دستے میں فرہاد زیدی اور مسرت جبیں ہی بھیجے گئے۔ پرچے پر نام مسرت کا شائع ہوتا تھا اور بجا طور پر ہوتا تھا، پس پردہ اورنگ زیب کے شہر سے آیا ہوا جوان سرگرم تھا۔

دونوں اب بھی سرگرم ہیں اور ہمارے جی کو خوشی دیتے ہیں۔

دو سرکردہ رفیقوں کے نام رہے جا رہے ہیں۔ نئے حریت میں پاکستان ٹیلیویژن کے پروگرام کسوٹی کے شہرت یافتہ عبداللہ بیگ جن کے حوالے ایک پورا صفحہ کیا گیا جس کا عنوان تھا: عبیداللہ بیگ سے پوچھئے۔ دوسرے انور مقصود تھے جنہیں اپنا مخصوص طنز و مزاح لکھنے کا کام سونپا گیا۔ مگر حریت کے مقدر میں نئے سرے سے جی اٹھنا نہیں تھا، سو نہیں اٹھا۔

سرکردہ اسکالر مصطفیٰ علی بریلوی صاحب سے ہم نے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے پرانے اخبارات کے ذخیرے سے 1947ء میں نقلِ وطن کے دوران ہونے والے قتل عام اور مظالم کی خبریں چن کر نکالیں اور سلسلہ وار ترتیب دیں۔ انہوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا اور بعد میں ان مضامین کو کتاب کی شکل میں چھاپا۔

ہم پھر آتے ہیں وطن عزیز کی طرف۔ ملک میں لاوا پک رہا تھا اور اُبال آنے کو تھا۔

ایوب خان کے لیے اقتدار کا دسواں برس بڑا بھاری پڑا۔ عجب بات ہوئی کہ انہوں نے عام لوگوں کی زندگی بہتر بنانے کے جتنے جتن کیے، سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پورا ملک ان کا دشمن ہو گیا۔ یہ کوئی غیر ملکی سازش تھی یا محترمہ فاطمہ جناح کی آہیں تھیں جو انہیں لے ڈوبیں۔

جو بھی نئی کمپنی کھلتی تھی یا کارخانہ لگتا تھا، اس کے ڈائریکٹروں میں ایوب خان کے ایک بیٹے کا نام ضرور ہوتا تھا۔ دوسرے بیٹے کے چال چلن کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں زور پکڑ رہی تھیں۔ کسی غیر ملکی جریدے نے لکھا کہ گوہر ایوب نے اپنے والد سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ انہیں افواہ سازی کا کارخانہ الاٹ کرا دیں کیونکہ ملک میں سب سے زیادہ اسی مال کی کھپت ہے۔ ایوب خان نے اپنے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر سے پوچھا کہ آخر یہ سب لوگ میرے بیٹے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ الطاف گوہر نے جواب دیا کہ لوگ آپ کو اپنی اولاد کے اعمال کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

نومبر سنہ 68ء میں راولپنڈی میں پولیس اور طالب علموں کا تصادم ہوا جو جنگ کی صورت اختیار کر گیا اور ایک لڑکا مارا گیا۔ ادھر پشاور میں ایوب خان ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ کسی نے گولی چلائی۔ ایوب خاں بچ گئے۔

اس پر یاد آیا کہ ان دنوں میں وہ ساری خبریں جمع کر رہا تھا جو جاری ہونے کے بعد منسوخ کرا دی جاتی تھیں۔ یہ خبریں میں ایک بڑے سے لفافے میں رکھتا جاتا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا ''خبریں، جو شائع نہ ہوسکیں۔''

ان میں پشاور کے فائرنگ کے واقعے کی خبر بھی تھی جس میں لکھا تھا کہ ایوب خاں بلٹ پروف روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہو کر تقریر کر رہے تھے۔ جیسے ہی گولی چلنے کی آواز ہوئی، وہ تیزی سے روسٹرم کے پیچھے چھپ گئے۔

بعد میں یہ خبر منسوخ کرا دی گئی۔ پھر ہوا یہ کہ کسی نے میری میز کی دراز کھول کر وہ پورا لفافہ چرا لیا۔ خدا جانے وہ کون تھا۔

ادھر یہ ہنگامے چل رہے تھے کہ ملک میں شکر مہنگی ہو گئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، سیر پر چار آنے بڑھے تھے۔ بس پھر تو قیامت ہو گئی۔ ایسی قیامت جو ملک کے ایک فیلڈ مارشل کو لے ڈوبی۔

جو کوئی شکر بیچ کر بھاری نفع کما رہا تھا، اس نے باقی ذخیرہ دبا لیا۔ لوگوں نے ایوب خان کے وزیر تجارت عبدالغفور ہوتی کو ''چینی چور'' کا خطاب دے دیا۔ ان کی مردان میں چینی کی بڑی

فیکٹری تھی۔ اس پر اتنا شور مچا کہ ایوب خان وزیر تجارت پر پھٹ پڑے اور ان سے استعفیٰ طلب کیا۔ کبھی کبھی چور بھی دلاور ہو جاتے ہیں، عبدالغفور ہوتی نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔

اب تو پورے ملک میں جگہ جگہ ہنگامے شروع ہو گئے اور پولیس اور مظاہرین میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ اُس زمانے میں مظاہرین کے ہاتھوں میں رائفل تو کیا، غلیل تک نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ مارے جانے لگے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ایوب خاں کے خلاف تحریک بھٹو نہیں، اصغر خان چلا رہے تھے اور مقبول ہو رہے تھے۔ اب پیپلز پارٹی والوں کو بتاتا ہوں تو وہ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اصغر خان کی مقبولیت دیکھ کر ذوالفقار علی بھٹو پر جو گزری وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اصغر خان کو آلو کا خطاب دے دیا۔

بھٹو صاحب کی حس مزاح کچھ اور طرح کی تھی۔ خان عبدالقیوم خان سے خفا ہوئے تو کہنے لگے کہ ان کے آگے بھی خان اور...... چلیے جانے دیجیے۔

ان کا ایک فقرہ نامہ نگاروں نے ازراہِ ہمدردی مہذب بنا دیا مگر مجھے ہمارے رپورٹر ثناء اللہ نے خود بتایا کہ مارچ سنہ 71ء میں ملک کی نئی قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں طلب کیا گیا اور مغربی پاکستان سے اسمبلی کے نومنتخب ارکان کو وہاں لے جانے کے لیے ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ اس وقت بھٹو صاحب نے ملک کی قومی اسمبلی میں شرکت کے لیے نہ صرف خود جانے سے انکار کر دیا بلکہ جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کوئی اس طیارے میں سوار ہوگا ہم اس کے لباس کا نچلا حصہ اتار لیں گے، گویا۔

نامہ نگاروں نے کہا کہ یہ بات طیش کے عالم میں کہی گئی ہے، اسے ذرا ملائم کر دیا جائے۔ چنانچہ خبر یوں لکھی گئی کہ جو کوئی اس طیارے میں سوار ہونے کی کوشش کرے گا، ہم اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔

اس زمانہ میں سیاستدانوں کا لب ولہجہ تلپٹ ہو رہا تھا۔ مجھے یاد ہے، جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی نے اپنی تقریر میں کچھ اس طرح کا جملہ ادا کیا جس کا مطلب تھا کہ ہم ملک وملت کے خلاف باتیں کرنے والوں کی زبانیں بند کر دیں گے۔

ذرا دیر بعد ایک ایجنسی نے یہ خبر انگریزی میں جاری کی جو میرے ہاتھ میں آئی۔ اب میں الجھن میں پڑ گیا۔ اردو کا محاورہ انگریزی سے جدا ہوتا ہے اور کسی کا منہ بند کرنے کا مطلب

اُسے رشوت کھلانا اور زبان بند کر دینے کا سیدھا سادا مطلب اسے جان سے مار ڈالنا ہوتا ہے۔ اس کی بجائے میں نے اس کا جو ترجمہ کیا اس کی حریت میں سرخی لگی ''ملک وملت کے خلاف باتیں کرنے والوں کی زبانیں کھینچ لی جائیں گی۔''

اگلے روز کارٹونسٹ زیدی نے کارٹون بنایا جس میں ایک شخص کی زبان کھینچی جا رہی ہے جو ڈول کی رسی کی طرح کھنچتی جا رہی ہے۔ کارٹون کے نیچے لکھا تھا ''جس قدر کھینچوں ہوں میں اتنی ہی کھنچتی جائے ہے۔''

جماعت والوں نے فرہاد زیدی صاحب سے شکایت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ محاورے کا محاورے سے ترجمہ کیا جائے تو یوں ہی ہوتا ہے۔ زیدی صاحب اپنے ساتھیوں کی بے مثال وکالت کیا کرتے تھے۔

ہنگامے شدت اختیار کر گئے۔ 16 فروری سنہ 69ء کو مشرقی پاکستان میں اگرتلہ سازش کیس کے دو ملزموں نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ پولیس نے گولی چلائی جس سے ایک ملزم مر گیا۔ اگلے روز اس کا جنازہ اٹھا۔ دس لاکھ افراد نے شرکت کی۔ مغربی پاکستان میں جنازے کے بغیر ہی اشتعال پھیلا ہوا تھا۔

سیاست کے اس منظر میں کہیں سے یوسف ہارون نمودار ہوئے۔ انہیں مغربی پاکستان کا گورنر لگا دیا گیا۔ الطاف گوہر کہتے ہیں کہ انہوں نے ایوب خان کو یقین دلایا تھا کہ ان کے مجیب الرحمان اور بعض دوسرے سیاستدانوں سے ذاتی مراسم ہیں اور وہ انہیں ایوب خان کی حمایت پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میری مجیب سے طویل ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ وہ ہر قیمت پر وزیراعظم بننا چاہتے ہیں۔

مجھے پھر کچھ باتیں یاد آئیں۔

یوسف ہارون، جو حریت اخبار کے مالک بھی تھے، جیسے ہی گورنر بنے، ہمارے رپورٹر ثناء اللہ کو ان کے کراچی کے گھر کے بجلی کے بلوں کا پلندا تھما دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ رقم معاف کرائیں۔ ہمارے پیارے رپورٹر ساری رقم معاف کرا لائے۔

اس زمانے میں کنڈے ڈال کر بجلی لینے کا رواج نہیں تھا۔

یوسف ہارون صاحب نے گورنری کے اعلان کے بعد اخباروں کے ایڈیٹروں کو چائے پر بلایا اور بتایا کہ وہ دو دن بعد اپنے عہدے کا حلف اٹھائیں گے۔ اس پر کسی نے انہیں توجہ دلائی

کہ آپ کا تقرر ماہ عزا کی ساتویں تاریخ کو ہوا ہے اور جب آپ حلف اٹھائیں گے، شبِ عاشور ہوگی۔ اس پر ان کی بیگم بولیں کہ میں نے بھی انہیں یہ بات بتائی ہے۔

نہیں مانے، امام حسین کے چہلم سے پہلے پہلے گورنری سے فارغ ہو گئے۔

ہم لوگ جو حریت کے ملازم تھے، نہ صرف محسوس کرتے تھے بلکہ جانتے تھے کہ ہارون گھرانہ مجیب الرحمان اور فیض احمد فیض کی مالی اعانت کرتا ہے اور فیض صاحب کو اسی لیے لیاری کے ایک نجی کالج کا تنخواہ دار پرنسپل مقرر کیا تھا۔ الطاف گوہر پر بھی ان کی نظر کرم تھی، کوئی مانے یا نہ مانے۔

سنہ 69ء کا آغاز اپنے ساتھ قیامت لایا۔ بھٹو، ولی خاں اور دوسرے سیاستدان جیل میں ڈالے گئے۔ مجیب پہلے ہی فوج کی تحویل میں تھے۔ ڈھاکہ میں ہنگامے شدت اختیار کر گئے اور حکومت نے ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔ اس پر تحریک پاکستان میں آگے آگے چلنے والے مولانا بھاشانی چراغ پا ہو گئے اور انہوں نے جلاؤ گھیراؤ کا نعرہ لگایا جسے لوگوں نے جی لگا کے سنا۔ مشرقی پاکستان میں ہڑتالوں نے زور پکڑا اور کارخانوں کو آگ لگائی گئی۔ فائرنگ سے کچھ لڑکے مرے۔ ان تین مہینوں میں ایوب خان کی کمر ٹوٹ گئی۔

سنا ہے ایک شام اپنے گھر میں بیٹھے تھے اور گھر کے بچے سامنے لان میں کھیل رہے تھے۔ وہ اپنا ایک جلوس سا نکال رہے تھے اور یہ جلوس "صدر ایوب، مردہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا۔

نئے مارشل لاء کا مرحلہ قریب تھا۔ یحییٰ خان لوگوں کو عہدے دلانے کے وعدے کر رہے تھے۔ ایوب خان نے حکومت کو ہاتھ سے جاتے دیکھا تو کہا "مجھے کوئی افسوس نہیں۔ میں خوش ہوں، میری دعا ہے کہ ملک سلامت رہے۔ لوگ تو پاگل ہو گئے ہیں۔"

اس کے راوی الطاف گوہر ہیں۔

مارچ کی پچیسویں تاریخ کو ایوب خان نے دوبارہ مارشل لاء لگانے کا اعلان کیا اور اقتدار فوج کے سربراہ یحییٰ خان کو سونپ دیا۔ صدر سے آخری ملاقات کے بعد تھکن سے چور یحییٰ خان نے بس ایک ہی فرمائش کی۔ صرف ایک جام۔

اس موقع پر ہم نے اور پوری قوم نے ریڈیو سے کان لگا کر دونوں کی تقریریں سنیں۔

دونوں تقریریں دوسروں کی لکھی ہوئی تھیں۔

یحییٰ خان نے 303 اعلیٰ افسروں کو نکالا اور اسے تطہیر کے عمل کا نام دیا گیا۔ انہوں نے

ون یونٹ کا خاتمہ کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول کا اعلان کیا یعنی مشرقی پاکستان کو مغربی بازو پر فوقیت دے دی گئی۔ بہت دنوں بعد ایک اچھی خبر آئی۔

ایک حیرت انگیز خبر اس سے ذرا پہلے بھی آئی۔ جولائی کے مہینے کی اکیسویں تاریخ تھی، پیر کا روز تھا کہ انسان پہلی بار چاند پر اترا۔ امریکہ کے ایک اخبار نے Monday کو Moonday قرار دیا۔ ہم لوگ انسان کی اس تاریخی کامیابی پر یہ سوچ کر حیران تھے کہ ہماری نسل نے پینسلین کی ایجاد سے لے کر انسان کے چاند پر اترنے تک کیا کیا دیکھا ہے۔

صبح اخبار آنے سے پہلے ہی ہمیں سُن گُن ملی کہ ہمارے برادر اخبار ڈان نے انسان کے چاند پر اترنے کی سرخی لگانے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ اس وقت تک صرف خلائی گاڑی چاند پر اتری تھی۔ اس کے اندر بیٹھے ہوئے خلانوردوں نے باہر نکل کر چاند پر قدم نہیں رکھا تھا۔ ڈان کے ایڈیٹر اَڑ گئے کہ میں یہ کیسے لکھ دوں کہ انسان چاند پر اتر گیا ہے۔

صبح ہونے سے پہلے دو خلانورد سیڑھی لگا کر چاند پر اتر گئے اور زمین کو پیغامات بھیجنے لگے۔ روزنامہ ڈان کو اگلی صبح ایک ورق کا ضمیمہ نکالنا پڑا جس کی سرخی تھی کہ انسان چاند پر اتر گیا۔ یہ ضمیمہ نہ نکلتا تو ڈان کا تاریخ ساز فائل ایڈیٹر کا منہ چڑاتا رہتا۔

سنہ 70ء شروع ہو گیا۔ سنہ 62ء کا آئین منسوخ ہو چکا تھا۔ یحییٰ خان نے نئے آئینی ڈھانچے کا اعلان کیا، ساتھ ہی مجیب الرحمان کے چھ نکات کا شور اٹھا۔ اس کے ساتھ مغربی بازو میں یہ شور بھی اٹھا کہ یہ بغاوت کا اور علیحدگی کا نعرہ ہے۔ چند تجزیہ کاروں نے کہا کہ ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہ کوئی ایسی بڑی بغاوت بھی نہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ مطالبے مونگ پھلی جیسے چھوٹے اور معمولی ہیں مگر لوگوں نے یہ بات سنی ان سنی کر دی۔ البتہ جو بات ذرا دھیان سے سنی گئی وہ یہ تھی کہ مجیب الرحمان کے چھ نکات کا اصل مصنف کوئی اور نہیں جناب الطاف گوہر ہیں۔ دونوں ہمارے ہارون گھرانے سے قربت رکھتے تھے۔

ان دنوں کے چند واقعات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کراچی میں ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ اس کی رپورٹ لانے کے لیے خدا جانے کیوں ثناء اللہ کو نہیں بلکہ مجھے بھیجا گیا اور ساتھ ہی ایک عجیب ہدایت کی گئی۔ ہدایت کہاں سے آئی تھی، مجھے نہیں معلوم لیکن ہدایت یہ تھی کہ پریس کانفرنس کی Negative رپورٹ درکار ہے۔ نیگیٹو یعنی منفی رپورٹ۔ میں ٹھہرا پیشہ ور صحافی۔ ایسی خبر لکھی کہ پڑھنے والا سوچتا رہ گیا ہوگا کہ بھٹو صاحب یہ

کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہیں۔ دوسرا واقعہ ذرا دیر بعد۔

یحییٰ خان کے بارے میں اب کہنا مشکل ہے کہ شراب اور عورتوں کے شوقین تھے یا خلاف معمول دیانتدار حکمران تھے۔

ماہ اکتوبر میں انہوں نے حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کا اعلان کر دیا اور یہی نہیں۔ انہوں نے ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں کی کھلی اجازت دے دی۔ لوگ سارے احتجاج اور مطالبے بھول بھال کر انتخابات کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مشرقی پاکستان میں قیامت کا طوفان اور سیلاب آیا جو بستیاں بہا کر لے گیا۔ تصویروں میں ہم نے دیکھا۔ ہر طرف لاشیں تیر رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان سے پہلی بار ایک عجیب آواز سنی گئی۔ ''پنجابی فوج ان لاشوں کو نکالے۔'' یہ مجیب کے چھ نکات سے ایک قدم آگے تھا کیونکہ اس میں نہ صرف نفرت بلکہ حقارت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

انتخابات ملتوی کر دیئے گئے۔

دسمبر میں انتخابات کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا۔ ایک طرف عوامی لیگ نے اور دوسری جانب پیپلز پارٹی نے بھرپور مہم شروع کر دی۔ مغربی بازو میں تو کچھ ووٹ دوسری جماعتوں کو بھی ملے لیکن مشرقی بازو کے عوام نے اپنے سارے کے سارے ووٹ عوامی لیگ کے بکسوں میں ٹھونس دیئے۔ اتنے ووٹ اور اتنی نشستیں لینے والی جماعت اب مقبولیت کے آسمان کو چھو رہی تھی۔ اسے ایک سو اہتر میں سے ایک سو سڑسٹھ نشستیں ملیں جبکہ مغربی بازو کی 144 نشستوں میں سے چھیاسی پیپلز پارٹی نے جیتیں یعنی اگر پورے ملک کو ایک ملک مان لیا جاتا، اے کاش ایسا ہوا ہوتا تو سمجھئے کہ عوامی لیگ نے تقریباً 57 فیصد اور پیپلز پارٹی نے 28 فیصد نشستیں حاصل کیں۔

لوگوں کو عدد اور ہندسوں کی اس بھول بھلیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ دو بڑے اور بھاری بھرکم امیدوار جیت گئے ہیں۔

رات تیزی سے ڈھل رہی تھی کہ حریت کے دفتر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ڈھاکہ سے ہمارے بے حد سرگرم، جوشیلے اور فعال نامہ نگار کا فون تھا جس کا نام کمال یا اسلام یا کچھ اس سے ملتا جلتا تھا۔ اپنے کچھ بنگالی کچھ بہاری لہجے میں بولا ''لیجیے مسٹر عابدی خبر لکھیے۔ میں اس وقت ڈھاکے میں بیت المکرّم کے سامنے موجود ہوں جہاں ایک بڑا ہجوم

انتخابات پر امن طور پر مکمل ہو جانے کا جشن منا رہا ہے اور یہ مجمع ''بھٹو مجیب بھائی بھائی'' کے نعرے لگا رہا ہے۔''

میں دوڑا اور جو شہ سرخی لگانے والی تھی، اس کی کتابت رکوائی۔ تیزی سے ڈھاکے کی خبر لکھی اور نئی شہ سرخی لکھی جانے لگی:

''ڈھاکہ کی سڑکوں پر بھٹو مجیب بھائی بھائی کے نعرے۔''

صبح صبح اخبار بازار میں آ گیا۔ کسی دوسرے اخبار میں اس واقعے کا ذکر تک نہ تھا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ یہ اخباری اصطلاح میں ہمارا اسکوپ تھا۔

شام کو میں سینہ تان کر دفتر پہنچا تو ایڈیٹر کو کچھ بجھا بجھا سا پایا۔ میں نے پوچھا ''زیدی صاحب! کیا ہوا۔''

کہنے لگے کہ مالکان نے صبح صبح بلا لیا۔ وہ اخبار سامنے پھیلائے اور سر پکڑے بیٹھے تھے۔ بھٹو مجیب بھائی بھائی کی سرخی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے کہ یہ اخبار ہم نے اس لیے تو نہیں نکالا تھا۔

اس دوران ملک ٹوٹنے کی کارروائی شروع ہوگئی۔

میں نے بی بی سی لندن میں ملازمت کی درخواست ڈاک میں ڈال دی۔

---------O---------

بڑی سرخی، بڑی تصویر

میں اپنی بات دہراتا ہوں۔ مجھے یہ طے کرنے میں مشکل ہو رہی ہے کہ جنرل یحییٰ خاں کو عورت باز کہوں یا پاکباز۔

کوئی کچھ کہے، انہیں اتنا ہوش تھا کہ ملک کو اگر ایک مان لیا جائے تو اس کا نیا حاکم شیخ مجیب الرحمان ہوگا۔

مجھے اے پی پی کی وہ خبر آج تک یاد ہے جس میں لکھا تھا کہ انتخابات کے بعد یحییٰ خان ڈھاکہ گئے۔ ہوائی اڈے پر مجیب الرحمان نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ سامنے دور تک بنگال کا سبزہ لہرا رہا تھا۔ یحییٰ خان نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: Mujeeb, This is all your domain now (مجیب! اب یہ سب تمہاری عمل داری میں ہے۔)

اس طرح ایک سے زیادہ مرتبہ کہا گیا کہ مجیب الرحمان ملک کے وزیراعظم ہوں گے مگر دوسرے پالے سے مسلسل یہ صدا بلند ہو رہی تھی کہ جس پارٹی کو مغربی بازو سے کوئی نشست نہ ملی ہو، وہ پارٹی اتنے بڑے علاقے پر حکمرانی کیسے کرے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ ہمیں مشرقی بازو میں قبول نہیں کیا گیا، ہم اس علاقے پر حکمرانی کیوں کریں۔

پھر وہ شام آئی جب میں اپنے چہیتے اور اکلوتے اسکوٹر پر بیٹھ کر دفتر جاتے ہوئے سولجر بازار کے علاقے سے گزر رہا تھا کہ کانوں میں بھٹو صاحب کی آواز آئی۔ نشتر پارک میں ان کا جلسہ عام تھا۔ میں نے اسکوٹر ایک طرف کھڑا کیا اور اتنے بڑے لیڈر کی تقریر اتنے ہی بڑے انہماک سے سننے لگا۔ ان کا وہ فقرہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے:

''اگر اقتدار دینا ہی ہے تو اِدھر ہمیں دو اور اُدھر انہیں دو۔''

ملک کو ایک ملک نہیں مانا گیا۔ یہاں تک کہ ملک کے مغربی بازو کو بھی ایک وحدت تسلیم کرنے میں یوں تامل ہوا کہ دو صوبوں میں مختلف پارٹیوں کی جو حکومتیں بنی تھیں، انہیں یوں چلتا کر دیا گیا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

مشرقی پاکستان والوں کو اندازہ ہو گیا کہ مغرب کے تیور اچھے نہیں۔ چنانچہ جن سڑکوں پر بھٹو مجیب بھائی بھائی کے نعرے لگے تھے وہاں یہ رشتہ یوں ٹوٹا کہ دنیا نے تڑاخ کی آواز سنی ہو گی۔

تحریک پاکستان کے بزرگ علمبردار مولانا بھاشانی جو اب تک جلاؤ گھیراؤ کا نعرہ بلند کرتے تھے، انہوں نے اب جو نعرہ لگایا اس کی خبر ترجمہ ہوئی اور ہم سب بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس پر کیا سرخی لگائی جائے۔ میں نے یوں ہی ذرا شوخی کے موڈ میں ایک فرضی سرخی لکھی۔ ''بھاشانی نے دیا سلائی پھینک کر کلہاڑی اٹھالی۔'' ہم لوگ اس سرخی سے لطف لے رہے تھے کہ فرہاد زیدی کسی کام سے نیوز روم میں آئے اور ہماری اجتماعی ہنسی کا سبب پوچھا۔ کسی نے میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی سرخی انہیں دکھا دی۔ اس سرخی کو پڑھ کر وہ بولے کہ یہ تو بہت اچھی سرخی ہے اور یہ کہہ کر وہ عبارت کتابت کے لیے کاتبوں کو دے دی۔

مولانا بھاشانی نے اُس روز کہا تھا کہ بہت ہو گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم پاکستان سے الگ ہو جائیں۔

ایک مولانا کیا، بنگال کے مسلم رہنماؤں کی بعد میں جو درگت بنی سو شکر ادا کرتا ہوں کہ اسے دیکھنے کے لیے میرے والد زندہ نہ تھے ورنہ مسلم لیگ کی تحریک میں ہاتھ بٹاتے ہوئے ہمیں یاد ہے کہ وہ بنگال کے مسلم رہنماؤں کے کتنے گن گایا کرتے تھے۔

جذبۂ جہاد ایک حد تک تو بڑا اچھا لگتا ہے مگر اپنی حدیں پھلانگ جائے تو تابوت میں ٹھونکی جانے والی آخری میخ ثابت ہوتا ہے۔ پتا نہیں وہ دو سر پھرے کون تھے جنہوں نے یا ہو کا نعرہ لگا کر بھارت کا ایک مسافر طیارہ اغوا کر کے لاہور میں اتروا لیا۔ طیارہ بھی ایسا جس کا نام گنگا تھا۔ اس وقت تو ہم نے اس خبر پر بڑی تالیاں بجائیں۔ ایک بہت بڑی تصویر چھاپی جس میں بھٹو صاحب طیارہ اغوا کرنے والے جذبہ جہاد سے سرشار دو جوانوں کو مبارکباد دے رہے تھے مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ وہ بلی جس کا نام بھارت ہے، اسی چھینکے کے ٹوٹنے کی منتظر تھی۔

دلّی سے اعلان ہوا: بس آج سے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان فضائی راہداری بند! پاکستان کے دونوں بازو کٹ گئے۔ کچھ پروازیں کولمبو کے راستے اڑائی گئیں تو ہندوستانیوں نے سری لنکا کی زندگی دشوار بنا دی۔ انہوں نے سمندری راستے میں بھی رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور اہلِ بنگال کو بغاوت پر اکساتے رہے۔ یحییٰ خان یقیناً ہوش میں ہوں گے۔ انہوں نے اتحاد کی کوششیں جاری رکھیں اور یہاں تک تیار ہو گئے کہ کنفیڈریشن آف پاکستان قائم کر دی جائے لیکن عوامی لیگ ہتھے سے اکھڑ چکی تھی۔

حالات بگڑتے ہی گئے۔ اہل بنگال کی چھاپہ مار تنظیم مکتی باہنی فوج سے ٹکر لینے لگی۔ آخر یحییٰ خان نے پینترا بدلا اور فوج کو اختیار دے دیا کہ باغیوں کی سرکوبی کرے۔ مجیب الرحمان گرفتار کر لیے گئے اور عوامی لیگ کو ممنوع جماعت قرار دے دیا گیا۔ (حکم بھی کیسی کمال کی چیز ہوتی ہے) اس کے ساتھ ہی جنرل ٹکا خان کو ناظم مارشل لاء بنا کر ڈھاکہ بھیج دیا گیا جہاں پہلے ہی ان کی اور ان کے نام کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

ہمارے نامہ نگار نے خبر دی کہ ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں بہت بڑا جلسہ عام ہو رہا ہے۔ دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں اور اہل بنگال مٹھیاں بھینچ بھینچ کر علیحدگی کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اسی دوران ٹکا خان کا ہوائی جہاز ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اترا۔ جلسہ گاہ میں اتفاق سے کسی نے کہا کہ ٹکا خان آ گیا ہے۔ لوگ سمجھے کہ جلسہ گاہ میں آ گیا ہے۔ لوگ جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بھارت کی جس شاخ پر نگاہ لگی ہوئی تھی، اس شاخ پر لگا پھل اب پوری طرح پک کر تیار تھا اور ٹپکنے ہی کو تھا۔ اس نے موقع مناسب پا کر اپنی فوج کو ہُشں کر دیا جس نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تاکہ فوج کا سارا دھیان سرحدوں پر لگا رہے اور ملک کے اندر علیحدگی پسند جوشیلی تنظیموں کو کھلا میدان مل جائے۔

اس وقت روزنامہ حریت کی انتظامیہ کا اجلاس ہوا جس میں مجھے نہیں بلایا گیا حالانکہ موضوع گفتگو میں ہی تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ مجھے سنہ 65ء کی جنگ کا تھوڑا بہت تجربہ ہے، کیوں نہ مجھے رپورٹنگ کے لیے مشرقی پاکستان بھیج دیا جائے۔ میں تو ذرا دیر کے لیے خوش ہوا لیکن میری بیوی اور گھر والوں نے انکار تو نہیں کیا بلکہ یہ شرط لگائی کہ میرا کم سے کم ایک لاکھ روپے کا بیمہ کرایا جائے۔

ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنیوں نے بھاری رقم مانگی ہوگی جسے میرے اخبار کی کمپنی نے وسائل ہوتے ہوئے بھی قبول نہیں کیا اور میں نہیں گیا لیکن میرے جاننے والے کچھ صحافی اور فوج کے تعلقات عامہ کے کچھ لوگ گئے۔ غنیمت ہے کہ وہ بعد میں واپس آئے لیکن جنگی قیدی بن کر۔

نومبر سنہ 71ء تک سرحدوں پر لڑائی چھڑ گئی اور بھارت نے اپنے ہتھیاروں پر دھار بٹھانے کا کام شروع کر دیا۔ اس کی پشت پر بہت سارے ملک تھے۔ اس معاملے میں عالمی رائے عامہ نے پاکستان کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ دنیا کی ایک عام رائے یہ تھی کہ اہل بنگال جس طرح انتخابات جیتے ہیں، اب ان کا حق ہے کہ جو چاہیں کریں۔ مجھے یاد ہے کہ ایران کے اخباروں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا اور وہی ایرانی حکومت جس نے سنہ 65ء کی جنگ کے دوران پاکستان کے طیاروں کو رات کے دوران اپنے ہوائی اڈوں پر پناہ لینے کی کھلی چھوٹ دی تھی، وہ بھی اس بار خاموش رہی۔

بھارت کی سب سے زیادہ حمایت روس کر رہا تھا۔ اس معاملے میں وہ اتنا آگے بڑھا کہ اس نے بھارت کے ساتھ جنگ میں تعاون کا معاہدہ کیا اور اسے بلینک چیک دے دیا کہ مصر میں موجود سوویت ہتھیاروں کے ذخیرے سے جو چیز چاہے اور جتنی مقدار میں چاہے لے لے۔

پاکستان کے لیے دل میں درد رکھنے والوں پر صدموں پر صدمے ٹوٹ رہے تھے۔ ایسے میں روس کے رویّے پر پاکستان سے ایک آواز اٹھی جس کا خدا جانے کیوں اب کوئی ذکر تک نہیں کرتا۔

میری نگاہوں میں وہ کاغذ تصویر کی طرح محفوظ ہے۔

فیض احمد فیض نے سوویت یونین کے جانبدار رویے کی مذمت کرتے ہوئے اپنے دستخطوں سے اخباری بیان جاری کیا تھا۔

حریت نے یہ بیان نمایاں طور پر شائع کیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قوم بائیں بازو کے ایک انقلابی شاعر کی اس وطن پرستی پر نعرۂ تحسین و آفریں بلند کرتی، لوگوں نے فیض صاحب سے مطالبہ شروع کیا کہ وہ اپنا لینن ایوارڈ واپس کریں۔

دنیا کے بہت بڑے شاعر نے چھوٹا سا جواب دیا: نہیں۔

جن دنوں مشرقی پاکستان میں قیامت خیز طوفان آ رہا تھا، عشق کی دنیا میں بھی کچھ ویسا ہی طوفان اٹھا۔

ایک چھوٹی سی خبر آئی کہ کراچی میں ایک اعلیٰ سرکاری افسر نے خودکشی کر لی ہے۔
مجھے مشرق کے عنایت اللہ صاحب بہت یاد آئے جو کہا کرتے تھے کہ خبر چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی۔ خبر کے ساتھ اخبار کا رویہ چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے۔
میں نے اس چھوٹی سی خبر کے ساتھ بڑا رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ خبر میں کچھ اس طرح کی بات کہی گئی تھی کہ اعلیٰ افسر نے یا تو خودکشی کی ہے یا اسے ہلاک کیا گیا ہے۔ میں نے ثناء اللہ اور اپنے دوسرے رپورٹروں کو جمع کیا اور کہا کہ یہ معاملہ سیدھا سادا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی بھید چھپا ہے۔ ذرا جاؤ اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔
رپورٹر تہہ سے کیا نکال کر لائے، وہ اگلی سطروں میں پڑھیے گا۔ اگلی صبح حریت واحد اخبار تھا جس کے صفحہ اول کی پیشانی پر اس سرے سے اس سرے تک سرخی لگی تھی: اعلیٰ سرکاری افسر نے زہر پی کر جان دے دی۔
پھر جب معاملے کے بھید کھلے تو وہ چھوٹی سی خبر بہت بڑی خبر نکلی۔ مرنے والا افسر کوئی اور نہیں، اردو زبان کے بے مثال شاعر مصطفیٰ زیدی تھے جو ابھی چالیس برس کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ پتا چلا کہ انہوں نے زہر کا پیالہ پیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ بڑا بھید یہ کھلا کہ زہر پینے والے وہ تنہا شخص نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت خاتون شہناز گل بھی تھیں جو کسی اور کی بیوی تھیں۔ دونوں نے معاہدہ کیا کہ یوں جینے سے بہتر ہے کہ دونوں مر جائیں۔ چنانچہ فلیٹ کے کمرے میں دونوں نے زہر پیا اور موت کا انتظار کرنے لگے۔ شاعر تو حساس ہوتا ہے، جلدی مر گیا، عورتیں سخت جان ہوتی ہیں، جی گئیں۔
اس کے بعد تو سارے اخبار اس خبر کی تفصیل کے پیچھے لگ پڑے اور ایسی ایسی داستانیں نکال کر لائے کہ مصطفیٰ زیدی اگر اُس وقت بچ جاتے تو اب مر جاتے۔
ہمارے رپورٹروں نے معاملے کے مختلف پہلو اپنے ذمے لے لیے اور بہت عمدہ خبریں ترتیب دیں۔ وہ مصطفیٰ زیدی کے ذاتی البم سے ان کی اور ان کے دو بچوں اور جرمن بیوی کی تصویریں لے آئے جن سے ایک پورا صفحہ آراستہ کیا گیا اور چونکہ اس وقت تک تمام راز نہیں کھلے تھے، ان تصویروں کا عنوان مصطفیٰ زیدی ہی کے ایک شعر سے اخذ کیا گیا ۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

ادھر شہناز گل عرف شہناز سلیم نازک حالت میں اسپتال پہنچائی گئیں جہاں ڈاکٹروں نے شاید قسم کھالی کہ اتنی خوش شکل خاتون کو مرنے نہیں دیں گے۔ جب وہ پوری طرح صحت یاب ہوگئیں اور عدالت میں پیش ہوئیں تو ہمارا ایک فوٹوگرافر (غالباً شمیم رضوی) ان کی قدِ آدم تصویر اتار لایا۔

میں نے صحافت کے اپنے تجربے میں اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی کسی کی اس سے بڑی تصویر نہیں چھاپی۔

میرے دوست افتخار عارف بتاتے ہیں کہ بعد میں کسی پارٹی میں ان کی شہناز سے ملاقات ہوئی تو افتخار نے اُن سے کہا کہ ابھی تو آپ پر دس بیس شاعر اور قربان ہوسکتے ہیں۔

اپنی صحافتی زندگی کی سب سے بڑی تصویر کے بعد اب سب سے بڑی سرخی کا قصہ بھی سن لیجیے مگر اس کا پس منظر طویل ہے۔

مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا تھا، ہمیں اتنا ہی علم تھا جتنا سرکاری ذرائع بتا رہے تھے۔ رہ گیا بی بی سی لندن تو ہم اس کی خبریں سنتے تھے اور اس کے مشہور نامہ نگار مارک ٹلی کو منہ بھر بھر کر کوستے تھے کہ جھوٹے پر خدا کی مار۔ ہم نے کاروں میں اندر کی طرف چپکانے کے لیے اسٹکر بھی چھاپے جن پر لکھا تھا کہ بی بی سی نہ سنیے جھوٹا ہے۔

ان دنوں مارک ٹلی کے بارے میں کثرت سے سننے میں آیا کہ وہ اپنی خبروں کے ذریعے مکتی باہنی کو اشاروں اشاروں میں بتاتا ہے کہ انہیں کب اور کہاں کارروائی کرنی چاہیے۔ اس کی خبروں سے احساس ہوتا تھا کہ پاکستانی فوج کے مظالم بھی بڑھتے جا رہے ہیں اور شکست کے امکانات بھی۔

بس پھر یہ ہوا کہ بھارت نے لڑائی چھیڑ دی۔ مشرقی پاکستان میں اپنی فوج پر دباؤ کم کرنے کے لیے حکومت نے مغربی پاکستان کے سرحدی علاقوں میں اپنی فوج کو آگے بڑھایا اور دونوں طرف کی فضائیہ حرکت میں آ گئی۔

بھارتی طیارے ہر رات کراچی کے اوپر آتے اور ماری پور کے فضائی اڈے اور کیماڑی کی بندرگاہ خصوصاً تیل کے ذخیروں پر حملے کرتے۔

ہمارے اخبار کا دفتر بندرگاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے ہم ڈرتے بھی تھے اور محتاط بھی رہتے تھے۔ دفتر کی عمارت کے نیچے بڑا سا تہہ خانہ تھا۔ ہوائی حملے کا سائرن سنتے ہی سارا عملہ

اس تاریک تہ خانے میں چلا جاتا تھا اور خوف کے عالم میں لوگ طرح طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے، ہمارے ساتھی طاہر احمر پر زیادہ دہشت طاری ہوتی تو اپنے خوف کو دبانے کے لیے وہ زور زور سے بولنے لگتے۔ ایڈیٹر صاحب نے دو چار بار تو سنا اور آخر ڈانٹا کہ آپ کو احساس نہیں کہ ڈر کے مارے آپ بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ طاہر احمر صرف یہ کہہ کر رہ گئے کہ جی نہیں، اصل میں مچھر ٹانگوں میں بری طرح کاٹ رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تہ خانے میں اتنے زیادہ مچھر تھے اور اتنا زیادہ بھن بھن کرتے تھے کہ یہی پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ مچھروں کا شور ہے یا بھارت کے حملہ آور طیاروں کا۔

ایک رات کام ختم کر کے میں واپس لوٹ رہا تھا۔ میرے اسکوٹر کی پچھلی نشست پر طاہر احمر بیٹھے تھے۔ شہر کی روشنیاں گل تھیں، سڑک پر اندھیرا تھا۔ ہوائی حملے کے اندیشے سے اسکوٹر کی روشنی بھی بند تھی، ابھی ہم لسبیلہ چوک کا پل عبور کرنے والے تھے کہ اچانک ہوائی حملے کا سائرن بجا۔ میں نے کہا کہ بھارت کے طیارے اس پل کو تباہ کریں گے اور ہماری بھی شامت آئے گی۔ ہم نے جلدی سے اسکوٹر ایک طرف کھڑا کیا اور سڑک سے دور ایک دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں دور سے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے لڑکپن میں دوسری عالمی جنگ کا زمانہ دیکھا تھا جب حملہ آور طیارے پورے پورے شہروں کو کھنڈر بنا جاتے تھے مگر طاہر مجھ سے زیادہ خوفزدہ تھے اور زور زور سے بول رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آہستہ بولیے۔ بھارتی ہواباز سن لیں گے۔

کچھ دیر بعد حملہ آور طیارے واپس چلے گئے اور ہم بخیر وعافیت اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچے۔ میں نے اپنے کمرے میں چھوٹی سی شمع روشن کی تھی کہ پچھلی گلی کے لوگ چلانے لگے۔ خوف سے شمع خود ہی بجھ گئی۔

ادھر بھارت نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں شدید بحران ہے اور لاکھوں پناہ گزین سرحد پار کر کے ہمارے علاقے میں آرہے ہیں۔ ہم خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ پناہ گزینوں کا تو خیر بہانہ تھا۔ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہمارے بغل میں ناسور بڑھتا جارہا ہے، ہم جراحت پر مجبور ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں اتار دیں۔

اس وقت ہم دنیا بھر سے آئی ہوئی خبریں دیکھ رہے تھے۔ کہیں سے پاکستان کے حق میں کوئی آواز نہیں اٹھ رہی تھی۔ بڑے بڑے دوست ملکوں نے یا تو چپ سادھ لی تھی یا دہ پاکستان کی مذمت کر رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ امریکہ کو کیا ہو گیا جس پر ہم لیاقت علی خاں سے لے کر

یحییٰ خان کی فرمانروائی تک تکیہ کرتے رہے ہیں۔ کم سے کم اسے تو ہماری مدد کو آنا چاہیے۔

بالآخر وہ خبر آئی جس کی ہم کب سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ خبر آئی کہ امریکہ کا بحری بیڑا ''امریکن انٹرپرائز'' مشرقی پاکستان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ اخبار کا سارا عملہ حرکت میں آ گیا۔

ابھی پچھلے برس لاہور کے اخباروں نے پہاڑ جیسی بڑی بڑی سرخیاں لگانے کا وتیرہ اختیار کیا تھا۔ اخبار کیا تھا، سڑک کنارے دیواروں پر چپکایا جانے والا پوسٹر نظر آتا تھا۔ مثلاً الیکشن میں پیپلز پارٹی آگے نکل گئی تو اخبار نے آدھے صفحے پر بہت بڑی سرخی لگائی ''بھٹو واہ'' اور دوسرے روز خبر آئی کہ انتخابات میں مذہبی جماعتیں پیچھے رہ گئیں تو اسی اخبار نے اتنی ہی موٹی سرخی لگائی ''مودودی ٹھاہ۔'' اس وقت تو ہم نے ایسا منہ بنایا جیسے کڑوی گولی منہ میں گھل گئی ہو لیکن امریکی بیڑے کے آنے کی خبر پا کر ہمارے اندر کا لاہور جاگا اور ایڈیٹر کے اشتراک سے ہم نے لاہور والوں سے بھی بڑی سرخی لگائی ''امریکہ آ گیا۔''

یہ سرخی نہیں تھی، تھپڑ تھا جو پھر ہم تادیر خود کو مارتے رہے۔

امریکہ نے کہا ''معاف کیجیے، ہم تو جنگ زدہ علاقے سے اپنے شہریوں کو بحفاظت نکال کر لے جانے کے لیے آئے تھے۔''

اپنی اس حماقت سے ہم نے یہ ضرور سیکھا کہ سیکھنے کا عمل ایک دن بھی نہیں رکتا، عمر بھر جاری رہتا ہے۔

دنیا نے پاکستان کو ٹوٹ جانے دیا کیونکہ پاکستان کو خود پاکستان نے توڑا تھا۔ 16 دسمبر سنہ 1971ء کو پاکستان کے نام نہاد ٹائیگر جنرل نیازی نے ڈھاکہ کے ایک وسیع اور کشادہ میدان میں اپنے ہتھیار بھارتی جرنیل کے اور اپنے 93 ہزار فوجی بھارتی فوج کے حوالے کر دیے۔ ہم نے سر جھکا کر اپنے ہاتھ بڑھائے۔ غنیم نے سر اونچا کر کے ان میں ہتھکڑیاں پہنائیں۔

قائداعظم کے مزار پر ایک دیہاتی بزرگ کو یہ کہتے سنا گیا ''لے بابا، اس الیکشن میں ہم نے تیرا آدھا قرض تو اتار دیا۔''

وہ دن اور آج کا دن، دل اس خیال سے رک رک جاتا ہے کہ کسی دن آ کر وہ دیہاتی بزرگ اپنی بات مکمل نہ کر دے۔

مجھے جو واحد سرکاری پریس ریلیز عمر بھر یاد رہے گی، اس کا ایک حرف بھی یاد نہیں کیونکہ

وہ سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا۔ ڈھاکے میں افواج پاکستان کی خواری کے بعد حکومت پاکستان کے پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے جو پریس ریلیز جاری کی وہ عجائب گھر میں رکھنے کے قابل تھی۔

ہم ترجمہ کرنے والوں کو اس کی ایک سطر بھی سمجھ میں نہیں آئی لیکن محکمہ اطلاعات کے حکام کا اصرار تھا کہ اس میں لکھا ہے کہ پاکستانی فوج کو شکست ہوگئی ہے اور اس نے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

کاش ہمارے درمیان کوئی موسیٰ ہوتا جو عیسیٰ کی لکھائی پڑھ سکتا۔

ادھر بی بی سی لندن کی ہندی سروس خوشی سے جھوم جھوم کر یہ خبریں نشر کر رہی تھی۔ ان کے ایک ہندی نشریئے کے خاتمے پر کہا گیا کہ اس کے بعد آپ اردو نشریہ سنیں گے لیکن سچی اور اصلی خبروں کے لیے اردو کے بعد ہندی کی اگلی مجلس سنیے گا۔ بی بی سی کی عالمی نشریات کے صدر مقام یعنی بش ہاؤس میں اعلیٰ حکام نے بنگلہ سروس کو مبارکباد کے تحریری پیغام بھیجے اور جس روز تقی احمد سیّد مرحوم کو پہلی بار یہ اعلان کرنا پڑا ہوگا کہ اس وقت پاکستان میں رات کے آٹھ، بھارت میں ساڑھے آٹھ اور بنگلہ دیش میں نو بجے ہیں، اس روز سنا ہے تھوڑے سے ریڈیو سیٹ ٹوٹے اور اَن گنت دل ٹوٹے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہتھیار ڈالے جانے اور قیدی بنائے جانے کے بعد یحییٰ خان نے اقتدار سے توبہ کی۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت اقوام متحدہ میں پاکستان کا کیس لڑ رہے تھے۔ انہیں پیغام بھیجا گیا کہ جلدی آؤ اور بچے کھچے ملک کو سنبھالو۔ 20 دسمبر کو بھٹو نے حکومت سنبھالی اور اپنے Brilliant Cousin بلا کے ذہین چچازاد بھائی ممتاز بھٹو کو صوبہ سندھ سونپ دیا۔ 3 دسمبر 1972ء کو شملہ میں مسٹر بھٹو اور مسز گاندھی نے شملہ معاہدے پر دستخط کیے۔ قیدی چھوٹ کے آئے۔ ان میں میرے بی بی سی کے ساتھی آصف جیلانی بھی تھے جنہوں نے کراچی پریس کلب میں اپنے قفس کے قصے سنائے۔ مجھے یاد ہے، انہوں نے بتایا کہ اور تو کچھ نہیں، بس رات کے سناٹے میں ان کے کانوں میں بیٹی کے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔

آخری قابلِ ذکر خبر جو میرے قلم سے لکھی گئی وہ جناب ممتاز بھٹو کی تحریر کی ہوئی وہ قرارداد تھی جسے سندھ اسمبلی میں منظور ہونا تھا۔ ثناء اللہ کہیں سے اس قرارداد کا پیشگی مسودہ لے آئے۔ اصل الفاظ تو میرے سامنے نہیں لیکن اس کے متن کا نچوڑ یوں ہے کہ سندھ عظیم صوبہ ہے اور عظیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے جس میں اتنی ہی عظیم زبان یعنی سندھی رائج ہے۔ اب سندھ کی

سرکاری زبان سندھی ہوگی اور ساری سرکاری کارروائی، ریکارڈ، درخواستیں، عرضیاں، حکم نامے اور فرمان سندھی زبان میں ہوا کریں گے۔

حریت والوں نے تو یہ کہہ کر کڑوا گھونٹ نگل لیا کہ بلاشبہ یہ عظیم صوبہ اور اس کی عظیم الشان زبان ہے لیکن اردو کچھ اتنی گری پڑی نہیں کہ اس کے ساتھ دودھ میں پڑی ہوئی مکھی جیسا سلوک کیا جائے۔

البتہ روز نامہ جنگ نے اس مجوزہ قرارداد پر صفِ ماتم بچھا دی۔ اس روز کا اخبار سیاہ حاشیے کے ساتھ نکالا گیا اور اس حاشیے کے اندر سفید حروف میں بیسیوں بار لکھا گیا تھا: اردو کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے۔

اس پر اردو بولنے والے علاقوں میں شدید ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی اور اسی علاقے میں جہاں فاطمہ جناح کی شکست پر جشن نما جلوس نکلوایا گیا تھا، وہیں اور اسی لالوکھیت میں اردو کے حق میں مظاہرہ کرنے والوں پر گولی چلی۔ کئی لاشیں گریں جو لالوکھیت کے چوراہے پر آج تک دفن ہیں۔

میں اپنی اور اپنے دور کی صحافت کی کہانی اس طرح کے نوٹ پر ختم نہیں کرنا چاہتا مگر حالات نے کبھی کسی کی سنی ہے جو وہ میری سنتے۔

رات رات بھر جاگ کر مشقت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے گردوں میں پتھریاں بننے لگیں۔ خوش قسمتی سے یہ پتھریاں دواؤں سے نکل جاتی تھیں لیکن ڈاکٹر کہتے تھے کہ آپریشن کراؤ ورنہ یہ سلسلہ رکنے کا نہیں۔

قدرت نے میری انگلی تھامی اور مجھے اس سرزمین پر اتار دیا جہاں کی آب و ہوا، خوراک اور طرزِ زندگی کچھ یوں تھی کہ میں صحت یاب ہو گیا اور اکبر الٰہ آبادی کے بقول اب انگلستان دیکھ رہا ہوں اور خدا کی شان دیکھ رہا ہوں، اخبار کے اُن رت جگوں سے نجات ملی اور بہت سے جھمیلوں سے پیچھا چھوٹا۔

جس روز میں نے اخباری صحافت ترک کی، میرے ذخیرۂ الفاظ میں ایک دلچسپ اضافہ ہوا۔ وہ تھا: لفافہ صحافت! اخبار نویسوں، نامہ نگاروں اور رپورٹروں کی نظر کرم ہو جائے، اس خیال سے لوگ انہیں لفافے دینے لگے جن کے اندر نئے نکور نوٹ رکھے ہوتے تھے۔ ہمارا وہ زمانہ رخصت ہو رہا تھا جب ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ کہیں ڈیڑھ روپے میں کھانا مل جائے۔ ہمیں حکومت نے اسلام آباد میں مکانوں کی پیشکش کی تھی مگر اتنی رقم کس کے پاس تھی کہ اس کی قسطیں ادا

کرے لہٰذا یہ کہہ کر پیشکش رد کر دی کہ ان مکانوں کے دروازے اتنے تنگ ہیں کہ ان کے راستے جنازہ باہر نہیں لایا جا سکتا۔ اس پر ایک وزیر ان مکانوں کے معائنے کے لیے گئے۔ اہلکاروں نے انہیں ایک فرضی تابوت اندر لا کر اور ایک جعلی جنازہ باہر نکال کر دکھایا۔ صحافیوں نے پھر بھی وہ کال کوٹھڑیاں لینے سے انکار کر دیا۔

اب تو خیر سے اسلام آباد میں اخبار نویسوں کی کوٹھیاں، بنگلے اور فارم ہاؤس ہیں۔ ابھی ٹیلی ویژن پر سنا، ایک کالم نویس کی کلائی میں تیس لاکھ کی گھڑی بندھی ہے اور اس کے فارم ہاؤس کے باہر اسلحہ بردار سکیورٹی گارڈ کھڑے ہیں۔

لیجیے چلتے چلتے اس پہلی اور آخری رشوت کا حال کہتا چلوں جو میں نے مانگی نہیں، جو مجھے دی گئی۔

ان دنوں اخباروں میں ایک نئی رسم چلی اور وہ شہر میں ہونے والی محرم کی مجلسوں کی خبریں چھاپنے لگے۔ ذاکر اور علماء اپنی تقریروں کی خبریں پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ تقریریں چونکہ دیر سے ہوتی تھیں اور ان کی اشاعت کی نوبت دوسرے تیسرے دن آتی تھی۔ اس پر ذاکرین نے یہ کیا کہ سہ پہر ہی کو نامہ نگار کو فون کر کے بتا دیتے تھے کہ آج رات کی تقریر میں وہ کیا کہیں گے۔ اس پر نامہ نگاروں کو علمائے دین کی طرف سے لفافہ ملنے کا عمل شاید ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

ان ہی دنوں ایک ذاکرِ شہدائے کربلا کا میرے پاس فون آیا کہ میں آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں۔ نئے نئے ذاکر تھے اور اس میدان میں حال ہی میں اترے تھے۔ میں نے کہا کہ ضرور تشریف لائیے۔ ان کے لیے چائے کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا آئے۔ میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ جب چلنے لگے تو بولے کہ اپنے تینوں بچوں کو تو بلائیے۔ انہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ میرے تینوں بچوں نے آ کر ادب سے انہیں سلام کیا۔ مولانا نے اپنی جیب سے دس روپے کے تین کرارے نوٹ نکال کر بچوں کو دے دیئے۔ میں کہتا ہی رہ گیا کہ اس کی کیا ضرورت ہے، یہ تکلف نہ کیجیے مگر وہ نوٹ دینے پر مُصر رہے۔ میں انہیں رخصت کرنے کے لیے باہر گیٹ تک آیا۔ چلتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے ''عابدی صاحب، میری جو تصویر یا خبر شائع کریں، اس میں مجھے مولانا کی بجائے علامہ لکھا کریں۔''

میں اخبار کی اپنی آخری رات کی بات اسی نوٹ پر اور ان ہی نوٹوں پر ختم کرتا ہوں۔

---------O---------

زبان کا فن

ریڈیو ہو، اخبار ہو، ٹیلی ویژن ہو یا دیوار پر لکھی ہوئی تحریر، سب کے پُراثر یا بے اثر ہونے کا دار و مدار زبان پر ہے۔ یہ کہنا آسان ہے کہ زبان اچھی ہو لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ اچھی زبان کیسی ہوتی ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کچھ پتے کی باتیں لکھنا چاہتا ہوں۔

اچھی زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سننے یا پڑھنے والے دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ لکھنے والے کو زبان کا شعور ہو اور سننے یا پڑھنے والے کی شخصیت کی تصویر اس کے ذہن میں ہو۔

میں اپنے تجربے میں عملاً ہزاروں افراد سے ملا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرا قاری یا سامع کون ہے۔ وہ چاہے پان کی دکان چلاتا ہو یا کوئی یونیورسٹی چلاتا ہو، مجھے سب ہی سے گفتگو کرنی ہے۔

میر تقی میر جیسے عظیم شاعر کے اکثر شعر سلجھے ہوئے، مختصر اور سہل اس لیے ہیں کہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ؎

گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

میرے خیال میں سب سے زیادہ پُراثر زبان گفتگو کی زبان ہوتی ہے۔ وہی سہل ہوتی ہے اور وہی تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کو سنیے۔ جب کبھی وہ لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر بول رہے ہوں تو اس میں گاڑھی ہندی جھلکتی ہے اور جب کبھی ان کے سامنے یا ان کے ہاتھ میں تحریری مسودہ نہ ہو تو وہ عام لب و لہجے

میں بول رہے ہوتے ہیں جسے ہندی نہ جاننے والے بھی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

یہ ایک عجیب انسانی خاصہ ہے کہ اگر آپ کسی کو دعوت دیں کہ وہ لکھ کر بولے تو امکان یہی ہے کہ وہ جناتی زبان لکھ لائے گا۔ لکھے بغیر بولنے میں یہ تو ہوسکتا ہے کہ گفتگو میں تسلسل نہ ہو اور بات بے ربط ہو جائے، اس کے باوجود بات بہتر طور پر سمجھ میں آئے گی کیونکہ اس کے سارے انداز فطری ہوں گے۔ اس میں گاڑھے لفظ مشکل ہی سے آئیں گے۔

ایسی صورت میں سب سے بہتر راستہ یہ ہے کہ آپ پوری گفتگو حرف بہ حرف لکھنے کی بجائے بنیادی نکتے لکھ کر سامنے رکھیں تا کہ کہی جانے والی کوئی بات کہنے سے رہ نہ جائے۔

ریڈیو والوں کی تربیت میں یہ تک سکھایا جاتا ہے کہ اگر ہو سکے تو آپ اپنا اسکرپٹ املا بول کر کسی اور سے لکھوائیں۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ اپنی تحریر مکمل کر کے اسے اونچی آواز سے پڑھیں۔ جگہ جگہ آپ کو لفظوں کی ترتیب بدلنا ہوگی۔ ایسا نہ کیا جائے تو مائیکروفون یا کیمرے کے آگے وہی اپنی عبارت پڑھتے ہوئے زبان لڑکھڑا سکتی ہے۔

ایک اور بہت ضروری بات۔۔ بے حد ضروری بات۔

آسان زبان لکھیے، عام فہم زبان لکھیے، ثقیل لفظ لڑھکانے سے علمیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ لفظ ہرگز نہ لکھیے جو آپ عام زندگی میں استعمال نہیں کرتے۔ اس کی ایک مثال لفظ ''تاہم'' ہے۔ مجھ سے کسی نے پوچھا کہ آپ اپنی تحریر میں یہ لفظ کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے ہمیشہ یہ جواب دیا کہ اپنے بیوی بچوں سے بات کرتے ہوئے میں نے لفظ تاہم آج تک استعمال نہیں کیا۔ بعض لفظ میں یہ کہہ کر رد کر دیتا ہوں کہ میری بیوی نہیں سمجھ سکتی۔ اپنے بہت سے اسکرپٹ نشر کرنے سے پہلے میں نے پڑھ کر بیوی کو سنائے ہیں۔

ایک اور ضروری بات، بے حد ضروری۔

چھوٹے چھوٹے جملے لکھیے۔ طویل اور پیچ دار بلکہ پیچ در پیچ جملے نہ لکھیے۔ پرنٹ میڈیا میں تو وہ شاید چل جائیں۔ ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر طویل اور الجھے ہوئے جملے سامع کے ذہن میں وہ تصور قائم نہیں کر سکتے جو لکھنے والے ذہن میں قائم کریں۔ سادہ زبان، مختصر جملے قاری یا سامع کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ •

زبان شائستہ ہو تو کانوں اور آنکھوں دونوں کو بھلی لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ''آپ کبھی ہمارے گھر آئیں'' اگر یوں ہو تو کتنا اچھا ہو کہ ''آپ کبھی ہمارے گھر آئیے۔''

لیکن جس عبارت کی بالکل معافی نہیں ہے اور جو ٹیلی ویژن پر عام ہوتی جا رہی ہے۔
اس کی چند مثالیں یوں ہیں:

آپ کبھی ہمارے گھر آؤ۔ آپ کب جاؤ گے۔ آپ ایک کام کرو۔

ٹھیک ہے، علاقائی لب و لہجے اپنی جگہ لیکن اگر کوئی بہتر، شستہ اور شائستہ لب ولہجہ دستیاب ہو تو اسے اختیار کر لینے میں کیا برائی ہے۔

مجھے عالمانہ زبان بہت ستاتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہاں درج ہے جو میں نے پاکستان کے ایک بہت بڑے اردو اخبار سے نقل کی ہے:

''زندہ اقوام وملل اپنے لیے شعائر رکھتی ہیں جوان کی جرأت و دلیری اور عزت وحرمت کی پاسبانی اور پاسداری کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک منتہائے غرض و غایت حیات بشر اور معراج کامیابی وسرفرازی زہد وتقویٰ ہے اور شعائر الٰہی عظمت و بلندی کی علامت ہے۔ اس بنا پر تعظیم شعائر الٰہی نہ صرف لازم ہے بلکہ اسے زہد وتقویٰ کہا گیا ہے۔''

اس کا کچھ مطلب ہوگا ضرور مگر سر کھپایا جائے تو اس کے بھید کھلیں گے۔

ایک اور ضروری بات۔ اختصار سے کام لیجیے۔ اس زمانے میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ لمبی لمبی تحریریں پڑھے۔ میں نے بارہا طویل خبریں درمیان سے چھوڑ دیں کیونکہ ان میں ایک کہانی مسلسل چلے جا رہی تھی جبکہ کام کی بات کہی جا چکی تھی۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی اور طوالت کی ذراسی بھی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے علاوہ ایک ضروری بات یہ ہے کہ کہنے کی بات تو چھوٹی سی ہوتی ہے۔ باقی سب زیبِ داستان کے لیے ہوتا ہے۔ اکثر مضامین میں، اکثر سے میری مراد ہے کثرت سے، نہایت لمبی چوڑی تمہید ایک عذاب بن جاتی ہے۔ صاحبِ مضمون بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی لمبی بات چھیڑتے ہیں اور بڑی مشکل سے اصل بات پر آتے ہیں۔ اسے بھی یا تو طویل کرتے ہیں یا ایک ہی بات بار بار یا تو ایک ہی انداز میں یا انداز بدل بدل کر کیے جاتے ہیں اور پڑھنے والا یا سننے والا الجھنے لگتا ہے کہ جو بات سرخی یا عنوان میں کہی گئی ہے، وہ مضمون میں کب آئے گی۔

میں لندن کے ایک اردو روزنامے میں شائع ہونے والا وہ مضمون کبھی نہیں بھولوں گا جس کا عنوان کچھ یوں تھا: برطانیہ میں اردو تعلیم کے مسائل۔ میری اس بات میں ذرا سا بھی مبالغہ نہیں کہ مضمون کچھ یوں شروع ہوتا تھا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو زمین پر اتارا...... وغیرہ

وغیرہ۔ آگے کیا لکھا تھا۔ مصنف ہی کو پتا ہوگا۔

پاکستان کے اکثر اخبارات ساری بڑی خبریں اپنے پہلے صفحے پر ٹھونس ٹھانس کر، ان پر چھ چھ سرخیاں لگا کر اور نیچے ان کی دو ڈھائی سطریں دے کر باقی صفحہ فلاں پر ڈال دیتے ہیں۔ پہلے صفحے پر اگر پچیس خبریں ہیں تو فلاں صفحے پر بقیے ہی بقیے بھرے ہوتے ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ دیر تک صفحہ الٹ پلٹ کرتا رہے اور بقیہ کی بھول بھلیوں میں مطلوبہ بقیہ ڈھونڈتا رہے۔ جب شکایت کی گئی تو دلچسپ جواب ملا۔ کہتے ہیں کہ پتا چلا ہے کہ لوگ صرف سرخیاں پڑھ کر اخبار بند کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایک ایک خبر پر پانچ پانچ سرخیاں جما کر ساری بات نمٹا دی جاتی ہے۔ بقیہ والے صفحے پر شاید ہی کوئی جاتا ہے۔

ایک بات ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

مگر جو ہمارے میڈیا پر ایک لعنت مسلّط ہوئی وہ ہے جگہ جگہ انگریزی الفاظ کی بھرمار یا ہندی ترکیبوں کا استعمال مثلاً مسئلے یا معاملے کو مُدا کہنا اور ''اس سوال کو لے کر یا اُس صورت حال کو لے کر'' کا جا بجا استعمال۔ اردو عبارت میں انگریزی تو بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں جیسے ان کی پہلی زبان انگریزی ہو حالانکہ انہیں اتنی سی بات بھی نہیں معلوم کہ Haven اور Heaven میں کیا فرق ہے۔ چنانچہ اکثر لکھا جاتا ہے کہ قبائلی علاقہ دہشت گردوں کی بہشت ہے۔ کمیں گاہ جیسا لفظ انہوں نے کبھی سنا بھی نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک شائع شدہ خبر کا تجزیہ کرنے سے پہلے اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھیوں سے ایک التماس ہے۔ اپنی تحریر اور تقریر میں حوالے سے، حوالے سے کی تکرار للہ ختم کیجیے۔ اچھے زمانوں میں ہم لکھا اور کہا کرتے تھے ''اس بارے میں۔ اس سلسلے میں۔ اس کے تعلق سے۔'' لیکن نئی نسل نے یہ ساری ترکیبیں ترک کر کے ''حوالے سے'' کی رٹ لگانی شروع کی ہے اور حیرت ہے کہ یہ تکرار ان کے کانوں پر گراں بھی نہیں گزرتی۔

آیئے اب ایک شائع شدہ خبر کا تجزیہ کریں۔

یہ خبر 6 جنوری سنہ 2011ء کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انگریزی لفظوں کی بھرمار اور بے تکے جملوں کی تکرار حیران کن ہے۔ مصنف نے عقل مندی کا صرف ایک کام کیا ہے۔ اس نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا ہے۔

پہلی سطر = تین انگریزی لفظ: ٹی وی رپورٹ۔ ٹی وی۔ چینل۔

دوسری سطر = ایک انگریزی لفظ: جج اسکینڈل (شاید قضیہ مراد ہے)

چوتھی سطر = ایک انگریزی لفظ: ایف آئی اے (یہ کیا بلا ہے شاید اہل پاکستان جانتے ہوں گے)

چھٹی سطر = ایک انگریزی لفظ: کرپشن (شاید بددیانتی مراد ہے)

ساتویں سطر = رپورٹ

دسویں سطر = ایم این ایز (غالباً ایم این اے کی جمع ہے جسے شرفاء ارکان قومی اسمبلی کہتے ہیں)

گیارہویں سطر = اسکینڈل۔ ایف آئی اے۔ ٹیم

بارہویں سطر = انٹرویوز کیے (بظاہر انٹرویو کی جمع ہے۔ انٹرویو سے مراد پوچھ گچھ ہے۔ اگر صرف ''انٹرویو کیے'' لکھتے تو وہ خود ہی صیغہ جمع بن جاتا)

پندرہویں سطر = ڈی جی ایف آئی اے (مراد ہے وفاقی تفتیشی ادارے کا سربراہ)

سولہویں سطر = دوبارہ ایم این ایز (ان صاحب کو انگریزی لفظوں کا صیغہ جمع بنانے کا بہت شوق ہے)

سترہویں سطر = تیسری بار ایم این ایز

اٹھارہویں سطر = ڈی جی جج (خدا جانے یہ کس بلا کا نام ہے۔ کہیں مراد ڈائریکٹر جنرل تو نہیں؟)

انیسویں سطر = یہ سطر پوری خبر کا حاصل مطالعہ ہے۔ تبصرہ نہیں کروں گا۔ آپ خود پڑھیے: ''انہوں نے ان کو Coat کرتے ہوئے بتایا'' ہمارے طرف اسے Quote کہتے ہیں اور جہاں جائز طور پر لفظ حوالہ لکھا جاسکتا تھا، ظالم نے انگریزی رسم الخط میں کوٹ لکھا ہے۔

بیسویں سطر = ایک بار پھر ایف آئی اے

23ویں سطر = ''ایک خطیر رقم ان کو دی تھی، یعنی قادر گیلانی کو دی'' (لاجواب وضاحت ہے

24ویں سطر = رپورٹ

25ویں سطر = ڈی جی جج

27ویں سطر = ''اس اہم سیٹ پر راؤ شکیل کو تعینات کیا گیا۔'' (سیٹ سے مراد عہدہ یا منصب ہے، یہ کسی اسمبلی کی نشست نہیں)

30 ویں سطر = ایف آئی اے کی تحقیقات میں جو فائنڈنگز ہیں (شرفاء اس کو تفتیش کے نتائج کہتے ہیں)

32 ویں سطر = ''نہ ہی اس سارے معاملے کو ٹچ کیا گیا ہے'' (اس ایک لفظ ٹچ پر ساری انگریزی زبان قربان)

36 ویں سطر = ''وہ حلف دینے کے لیے تیار ہیں'' (ان کی مراد ہے وہ حلفیہ طور پر کہنے کے لیے تیار ہیں)

37 ویں سطر = ایک بار پھر ایم این ایز (مہذب لوگ ارکان قومی اسمبلی کہتے ہیں)

38 ویں سطر = پھر ایم این ایز

43 ویں سطر = پڑھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو: ''ہمارا اس کے ساتھ تھوڑا سا کمفرٹ لیول ہوا مدینہ شریف میں'' آپ کا یہ کمفرٹ لیول ہوگا، ہماری روح میں تو یہ کانٹا بن کر چبھا۔

45 ویں سطر = پڑھیے: ''ہم نے راؤ شکیل سے پوچھا کہ آپ ای سی ایل پر ہونے اور نیب کو مطلوب ہونے کے باوجود کیسے اِدھر لگ گئے'' (ان کی مراد ہے یہاں آپ کا تقرر کیسے ہوگیا اور یہ ای سی ایل کس بلا کا نام ہے)

46 ویں سطر = آگے جواب پڑھیے ''تو انہوں نے بولا'' (ان کی مراد ہے انہوں نے کہا)

47 ویں سطر = ''تو انہوں نے بولا کہ میں کوئی ایسے تو آرام سے نہیں لگ گیا۔ میں کروڑوں روپے دے کر ڈی جی حج لگا ہوں۔'' (کس غضب کا آرام ہے اس فقرے میں)

49 ویں سطر = ''مگر ہم نے جب ادھر اپنی انکوائری کی۔ اپنی ریسرچ کی کہ کس ریفرنس سے یہ پی ایم تک پہنچا'' (یہ جملہ جوں کا توں اخبار ڈان میں چھپ سکتا ہے)

53 ویں سطر = ''ہم نے تاریخیں یہ ساری کنفرم کیں'' (ان کی مراد ہے کہ ہم نے ان ساری تاریخوں کی تصدیق چاہی)

56 ویں سطر = ''زین سکھیرا عبدالقادر گیلانی کے کلاس فیلو ہیں۔'' (پڑھے لکھے لوگ ہم جماعت کہا کرتے ہیں)

56 ویں سطر جاری ہے = وہ گیلا نیز کے فیملی فرینڈ ہیں۔ (اب میں کیا عرض کروں)

59 ویں سطر = ''عمرے پر وہ گئے ہیں، زین سکھیرا'' (کہنا یہ چاہتے ہیں کہ زین

سکھیرا عمرے پر گئے ہیں)

60 ویں سطر = ''ان کی جتنی ڈیلز ہوئی ہیں، وہ یہ زین سکھیرا کرتے ہیں۔'' (میں چپ رہوں گا)

61ویں سطر = ''جتنے کانٹریکٹس ہوتے ہیں، یہ ان کے نام پر ہوتے ہیں۔''

62 ویں سطر = ''ان کے بچوں کے جو فرنٹ مین ہیں، وہ زین سکھیرا ہیں اور ان کا تعلق عارف والا سے ہے جو ساہیوال کے نزدیک ہے'' (فرنٹ مین کی گلی اور مکان کا نمبر اور ڈاک خانے کا نام بھی لکھ دیتے تو پوسٹ کارڈ کو پہنچنے میں آسانی ہوتی)

یہ ہے اخبار میں زبان کی توقیر اور گفتگو کا احترام۔ زبان کوئی بھی ہو، معزز ہوتی ہے، مقدس ہوتی ہے اور واجب الاحترام ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ کھلواڑ معاشرے کی ذہنی کیفیت کی عکاسی بن جاتی ہے۔ زبان کو مسخ کرنے والے نہیں جانتے کہ اس سے ان کے نفسیاتی خلفشار ہی کی نہیں، کم علمی، کم فہمی اور ناسمجھی کی تصدیق ہوتی ہے اور انہیں بھرتی کرنے والے آجروں اور برداشت کرنے والے ایڈیٹروں کی بے حسی پر دِل دُکھتا ہے۔

---------O---------

زبان کو برتنے کا ہُنر

کسی جگہ میں نے لکھا تھا ’’خاتون بولیں کہ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ تم کتنے بھولے ہو اور یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ تم اتنے بھولے ہو؟‘‘

اس فقرے کو صحیح لب و لہجے میں پڑھنا آسان نہیں۔ تحریر کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ اس میں اپنے جذبات اور احساسات تو شامل کر سکتے ہیں، اپنا لہجہ شامل نہیں کر سکتے۔

میں نے کسی کو بڑے شگفتہ لہجے میں خط لکھا، انہیں لگا کہ میں نے شدید غصے کی کیفیت میں لکھا ہے۔ انہوں نے شکایت کی تو میں نے کہا اسی خط کو ذرا مسکرا مسکرا کر پڑھیے اور پھر دیکھیے۔

انگریزی میں کہتے ہیں کہ پڑھت کا کمال Stresses اور Pauses میں ہے یعنی جہاں ضرورت ہو وہاں لفظ کو زور دے کر ادا کیا جائے اور یہ کہ جملے کو صحیح جگہ توڑا جائے یا لمحہ بھر کا وقفہ یا سکوت دیا جائے گا۔

وقفے یا سکوت کی خوبی غالب کے اس مصرعے میں دیکھی جا سکتی ہے جسے بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی غلط یعنی یوں پڑھتے ہیں ۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

لیکن صحیح جگہ وقفہ دیا جائے تو اصل میں یہ مصرعہ یوں ہے ۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت / کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

سکھیرا عمرے پر گئے ہیں)

60 ویں سطر = ''ان کی جتنی ڈیلز ہوئی ہیں، وہ یہ زین سکھیرا کرتے ہیں۔'' (میں چپ رہوں گا)

61ویں سطر = ''جتنے کانٹریکٹس ہوتے ہیں، یہ ان کے نام پر ہوتے ہیں۔''

62 ویں سطر = ''ان کے بچوں کے جو فرنٹ مین ہیں، وہ زین سکھیرا ہیں اور ان کا تعلق عارف والا سے ہے جو ساہیوال کے نزدیک ہے'' (فرنٹ مین کی گلی اور مکان کا نمبر اور ڈاک خانے کا نام بھی لکھ دیتے تو پوسٹ کارڈ کو پہنچنے میں آسانی ہوتی)

یہ ہے اخبار میں زبان کی توقیر اور گفتگو کا احترام۔ زبان کوئی بھی ہو، معزز ہوتی ہے، مقدس ہوتی ہے اور واجب الاحترام ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ کھلواڑ معاشرے کی ذہنی کیفیت کی عکاسی بن جاتی ہے۔ زبان کو مسخ کرنے والے نہیں جانتے کہ اس سے ان کے نفسیاتی خلفشار ہی کی نہیں، کم علمی، کم فہمی اور ناسمجھی کی تصدیق ہوتی ہے اور انہیں بھرتی کرنے والے آجروں اور برداشت کرنے والے ایڈیٹروں کی بے حسی پر دِل دُکھتا ہے۔

---------O---------

ایک اور مشہور مثال یہ تاریخی فقرہ ہے:

روکو مت جانے دو

روکو کے بعد وقفہ دیا جائے تو کچھ اور معنی ہیں اور مت کے بعد سکتہ آئے تو مفہوم بالکل بدل جاتا ہے۔

Stress کی آسان مثال اس عام فقرے میں ہے۔ مثلاً آپ کہنا چاہتے ہیں کہ باقی لوگ پرسوں آئیں گے لیکن وہ کل آئے گا۔ اس میں آپ کل پر زور دیں گے اور اگر کہنا چاہتے ہیں کہ باقی لوگ نہیں آئیں گے البتہ وہ آئے گا تو آپ لفظ وہ پر زور دیں گے۔

اردو میں ایک بہت ہی دلچسپ مثال لفظ ''اچھا'' ہے۔ ایک بار ہم دوستوں کی محفل میں کسی نے یہ شغل چھیڑا کہ لفظ ''اچھا'' کو لہجہ بدل بدل کر ادا کرو۔ کم سے کم بارہ لہجے دریافت ہوئے۔ مثالیں دیکھیے:

اچھا= (ٹھیک ہے، سمجھ میں آ گیا)

اچھا= (واقعی؟)

اچھا= (یوں بھی ہے)

اچھا= (دیکھ لیں گے)

اچھا= (اچھا بابا اچھا، تم جیتے ہم ہارے)

جملے میں وقفے اور سکوت کا دلچسپ قصہ یہ ہے جو میں نے پاکستان میں خبریں پڑھ کر سنانے والوں کی زبانی بارہا سنا ہے:

اقوام متحدہ کے سیکرٹری۔ جنرل بان کی مون

ہم لوگوں کو کتنی آسانی سے فوجی بنا دیتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کے لیے ادائیگی کا انداز بہت معنی رکھتا ہے۔ خبر میں پڑھنے والے پر لازم آتا ہے کہ جو خبر پڑھ کر سنائے اس میں اپنے جذبات اور احساسات شامل نہ کرے۔ اس غریب کا فرض ہے کہ غیر جانبدار رہنے کی خاطر مشین کی طرح پڑھتا چلا جائے۔ کسی کے انتقال کی خبر ہو یا ولادت کی، ایک آفاقی اصول یہ ہے کہ نیوز ریڈر اس میں نہ اپنا دکھ شامل کر سکتا ہے اور نہ خوشی۔ یہ رسمی یا Formal ادائیگی ہے۔ البتہ ریڈیو یا ٹی وی میں عام گفتگو جو غیر رسمی یا Informal ہوتی ہے، اس میں جذبات شامل ہونا فطرت کا تقاضا ہے۔ ریڈیو میں چہرے کے

اتار چڑھاؤ یا مسکراہٹ نظر تو نہیں آتی لیکن لہجے میں صاف محسوس ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن میں نہ صرف یہ سب بلکہ ہاتھ پاؤں اور بدن کی حرکات وسکنات بھی نظر آتی ہیں جسے انگریزی میں Body language کہا جاتا ہے۔

ریڈیو پر اچھی ادائیگی کے لیے کہا جاتا ہے کہ بولتے یا تحریر پڑھتے ہوئے ہاتھ اس طرح چلائیے جیسے روزمرہ گفتگو کے دوران چلاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بار بار نگاہ اٹھا کر مائیکروفون کو بھی دیکھیے۔ اس سے ادائیگی میں فطری خوبیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ساتھی محمد غیور مرحوم کی عادت تھی کہ مائیکروفون پر خبریں یا تبصرہ پڑھتے ہوئے بار بار سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا کرتے تھے، مگر صرف دیکھا ہی کرتے تھے۔ انہیں وقت سے کوئی غرض نہیں تھی۔

مائیکروفون پر بولنا عام زندگی میں بولنے سے تھوڑا سا مختلف ہوتا ہے۔ ہم صاف زبان بولنا چاہتے ہیں، ہر لفظ صاف صاف ادا کرنے کی عمداً کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ضروری ہے کہ ہماری بولنے کی فطری رفتار میں فرق نہ آئے۔

فطرت سے قریب رہنے میں بڑی دانائی ہے۔ تصنع اور بناوٹ براڈکاسٹنگ میں سب سے بڑی لعنت ہے۔ ایک دور تھا جب ریڈیو پاکستان کے اناؤنسر اپنے گلے سے کھرج کے ساتھ کراری آوازیں نکالا کرتے تھے۔ ایسا وہ پتا نہیں کیوں کرتے تھے۔ آج بھی ایک صاحب ''کریمنل موسٹ وانٹڈ'' نامی پروگرام میں وہی آواز نکالتے ہیں (یاد رہے کوئی پروگرام کے عنوان سے دھوکا نہ کھائے۔ یہ پروگرام اردو میں ہے)

بناوٹ اور تصنع سامعین اور ناظرین سے چھپے نہیں رہتے۔ سمجھدار لوگ لمحہ بھر میں بھانپ لیتے ہیں کہ رو رو کر دعائیں مانگنے والے کی آنکھ میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

یہاں براڈکاسٹنگ کا ایک اصول دہرانا چاہتا ہوں۔ اپنے سامعین یا ناظرین کو کبھی ناسمجھ نہ سمجھیے۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو کسی لفظ کا اصل تلفظ نہیں معلوم اور آپ منہ سے وہ لفظ یوں ادا کرتے ہیں کہ سننے والے کو احساس نہ ہونے پائے، تو یوں نہیں ہوتا۔ لوگ معاملے کی حقیقت کو جاننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتے۔

میں ایک بار پھر ریڈیو پاکستان کی آوازوں کی طرف لوٹتا ہوں۔ اس وقت بیشتر براڈکاسٹر خصوصاً جو دکن سے آئے تھے، ایک عجیب کراری سی آواز نکالا کرتے تھے۔ اچانک ان کے درمیان ایس ایم سلیم کہیں سے نمودار ہوئے جن کی آواز نرم اور ملائم تھی۔ وہ دیکھتے دیکھتے

سامعین کے ہیرو بن گئے اور انہوں نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرلیا۔ سامعین نے اپنے ذہن میں ایک گبرو جوان کی تصویر بنالی۔ براڈ کاسٹر کو اور کیا چاہیے۔

اس موضوع کے آخر میں اس کا نچوڑ:

اصول یہ ہے کہ مائیکروفون پر اداکاری نہ کیجیے۔ صداکاری کیجیے۔ سپاٹ نہ پڑھیے۔ اس میں گفتگو کا انداز شامل کیجیے۔ ہاتھ چلائیے۔ آنکھیں چلائیے اور ''نہیں'' کہتے ہوئے اگر نفی میں گردن بھی ہلا دیں تو کیا اچھی بات ہے۔

یہ باتیں اصولاً کتاب ''ریڈیو کے دن'' میں شامل ہوتیں لیکن میڈیا کی بات ہے، سب پر صادق آتی ہے۔

اب کچھ گفتگو ترجمے کے بارے میں۔

---------O---------

ترجمے کے رموز

جن لوگوں نے انگریزی بہت پڑھی ہو اور انہیں اردو پر بھی عبور حاصل ہو وہ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ قلم اٹھائیں گے اور ترجمہ شروع کر دیں گے، وہ یہ خیال ذہن سے نکال دیں۔ ترجمے کا فن سب سے الگ ہے اور بڑی مشقت اور ریاضت مانگتا ہے۔

اس بات کو اس ذرا سی بات سے سمجھ لیجیے کہ In کا مطلب اندر اور Out کا مطلب باہر ہونا ضروری نہیں۔

ترجمہ زبان کا نہیں بلکہ تہذیب کا ہوتا ہے۔ ہر زبان کے اپنے بندھن اور اپنی پابندیاں ہوتی ہیں، ترجمہ کرتے وقت ایک تہذیب اور ایک ثقافت کو جدا تہذیب اور ثقافت میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ترجمہ ایک ایسا پرندہ ہے جو ایک زبان سے اڑان بھرتا ہے، راہ میں اس زبان کا چولا اتار کر نیا چولا پہن کر دوسری زبان کی شاخ پر اترتا ہے۔

میں یہ بھی کہتا ہوں کہ Translation کچھ نہیں ہوتا، دراصل یہ Transformation ہوتا ہے۔ انگریزی اصطلاحیں لکھنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

انگریزی اور اردو قواعد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ انگریزی میں آسمان نیچے اور زمین اوپر ہے۔ کہنے میں یہ بات عجیب لگتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ انگریزی جملے کی ساخت میں سب سے ضروری بات پہلے اور سب سے کم ضروری بات جملے کے آخر میں آتی ہے۔ اردو میں یوں نہیں ہوتا۔ مثال دیکھیے:

"Ten People were killed in an explosion in Baghdad this morning."

لفظی ترجمہ یوں ہوگا: دس افراد مارے گئے، ایک دھماکے میں بغداد میں آج صبح۔اس ترجمے پر دنیا ہنسے گی، لہٰذا ہم جملے کو الٹ دینے پر مجبور ہیں:

''بغداد میں آج صبح ایک دھماکے میں دس افراد ہلاک ہو گئے۔''

انگریزی میں سرخی ہوگی "Ten People Killed in Baghdad"

اردو میں سرخی یوں لگے گی: ''بغداد میں دس افراد ہلاک''

اس کا کوئی علاج ہے؟ لوگ پوچھتے ہیں۔

اس کا علاج چھوٹے جملوں میں ہے۔ میں بتاتا ہوں۔مثلاً:

''بغداد میں دس افراد مارے گئے۔ اطلاع یہ ہے کہ آج صبح وہاں ایک دھماکہ ہوا تھا۔''

لیکن لفظ ''تھا'' لگتے ہی خبر پر قدامت کا رنگ چھائے گا، لہٰذا مجبوری کی صورت میں یوں ہوسکتا ہے ''بغداد میں آج صبح ایک دھماکے میں دس افراد ہلاک ہوئے ہیں۔'' خبروں میں صیغۂ ماضی سے گریز کیا جائے تو اچھا ہے۔ صیغۂ حال خبر کے تازہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔اردو اخباروں کو اس کی عادت نہیں لیکن عادت بدلنے میں کسی کا کیا جاتا ہے۔

ترجمے کے بارے میں ایک بات بنیادی ہے۔انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی عبارت میں کبھی کبھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ انگریزی سے ترجمہ ہے۔ ہمارے بعض رپورٹر اپنی خبریں انگریزی میں لکھتے ہیں جو برادر اخبار کے لیے اردو میں ترجمہ کی جاتی ہے اور جن کا ایک ایک فقرہ بتا رہا ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہیں اور یہ کہ مترجم اناڑی ہے۔

اس سے بچنا ضروری ہے اور یہی ترجمے کی خوبی ہے۔

ترجمے میں اصطلاح سازی ضرور ہونا چاہیے۔ جو اصطلاحیں رائج ہیں ان کا احترام کیا جانا چاہیے۔ بعض ایک عربی، فارسی یہاں تک کہ ہندی سے بھی اٹھائی جاسکتی ہیں مثلاً Subsidy کا ترجمہ زرِتلافی فارسی لغت سے ملا اور رائج ہو گیا لیکن Ransom کا اتنا ہی عمدہ ترجمہ زرِخلاصی بھی وہیں سے ملا لیکن اس نے رواج نہیں پایا fundamentalism کا ترجمہ بنیاد پرستی وضع کرنا پڑا۔Militant کا ترجمہ شدت پسند ٹھہرا۔ کچھ لوگ عسکریت پسند بھی کہنے لگے ہیں۔

Progress کا ترجمہ پیش رفت پہلے پہل راولپنڈی کے ایک اخبار کی سرخی میں نمودار

ہوا تھا، فوراً قبول کر لیا گیا۔ Haven کا ترجمہ بہشت نہیں، کمیں گاہ یا جائے پناہ ہوتا ہے۔ Peace Process کا ترجمہ ''امن عمل'' مجھے قبول نہیں کیونکہ کانوں کو بھلا نہیں لگتا۔ اس طرح anti government کا ترجمہ حکومت مخالف مظاہرے طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ترجمے میں ایسا بارہا ہوتا ہے کہ مثال کے طور پر بارہ الفاظ کا انگریزی فقرہ اردو میں ترجمہ ہو کر سات الفاظ کا رہ جاتا ہے۔ اگر کبھی اس کے برعکس صورتحال پیدا ہو جائے تو یوں بھی صحیح۔ قیام امن کا عمل اور حکومت کے خلاف مظاہرے لکھنے میں کوئی بڑا نقصان تو نہیں۔

ایک اور ضروری بات۔ ترجمہ کرتے ہوئے ڈکشنری دیکھنے میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ بہت ممکن ہے اس میں زیادہ مناسب لفظ مل جائے۔ اس کے علاوہ جس ادارے میں کئی لوگ بیٹھے لکھ رہے یا ترجمہ کر رہے ہوں، وہاں اپنے ساتھیوں سے مدد مانگنا ذرا بھی معیوب نہیں۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض اداروں کی اپنی مخصوص اصطلاحات اور ترکیبیں ہوتی ہیں اور عملے کے ہر فرد کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ ادارے کا مخصوص انداز اختیار کرے۔ میں کبھی ڈکشنری دیکھتا ہوں تو اپنے ساتھیوں کو بتا دیتا ہوں کہ اس ترجمے پر عدالت میں طلبی ہو سکتی ہے۔

کہیں انگریزی یا یورپین لفظ استعمال کرنا پڑے تو بہتر ہے کہ اسی زبان کے تلفظ میں کیا جائے مثلاً grand prix کو گراں پری لکھا جائے۔ جیسا یہ لفظ نظر آ رہا ہے ویسا لکھا گیا تو نہایت معیوب ہوگا۔

تلفظ کی بات آ گئی تو اب ہم اس پر نہایت اہم موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اردو میں ہندی کی طرح ماترائیں نہیں ہوتیں نہ ہی زیر زبر لگانے کا رواج ہے۔ اس لیے بارہا لوگ غلط تلفظ کرتے ہیں۔ اگلا باب سارا کا سارا اسی بارے میں ہے۔ امید ہے اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

---------O---------

یہ مسائلِ تلفّظ

ہمارے دوست ادریس صدیقی نے اس نام سے ایک کتابچہ لکھا تھا۔ یہ بات پرانی ہوئی۔ پتہ چلا کہ ادریس صدیقی گزر گئے اور ساتھ ہی ان کا کتابچہ بھی۔ صدیقی صاحب کا تعلق بھی ریڈیو سے تھا اور ریڈیو سے وابستہ لوگوں کو حلق میں آنے والے بلغم کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ستاتی ہے وہ ہے لفظوں کی ادائیگی اور اُن کا تلفظ۔

لکھنے والوں کو ہجّوں سے غرض ہوتی ہے۔ ان کا سارا زور املا پر ہوتا ہے۔ اپنی تحریر کو ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر سنانے والوں کا املا غلط ہو تو دنیا کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ مطالبہ کو اگر متالبہ لکھ لاتے ہیں تو کسی کو کیا معلوم۔ البتہ ان کی دشواری یہ ہے کہ م کے اوپر پیش لگایا جائے یا زبر۔ اس لفظ کو مُطالبہ پڑھا جائے یا مَطالبہ؟

اردو لکھائی میں زیر زبر پیش لگانے کا رواج نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ تشدید کبھی کبھار لگ جاتی ہے۔ ساکن کیا ہوتا ہے، سو میں سے دو آدمی جانتے ہوں تو بہت ہے۔ لہٰذا اردو سیکھنے والوں کی کانوں کے راستے جو تربیت ہوتی ہے، اُسی کی بنا پر وہ تلفظ ادا کرتے ہیں۔

اسی لیے میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ عوام کو صحیح املا اور ہجّے سکھانے کی ذمہ داری اخباروں، رسالوں اور کتابوں پر عائد ہوتی ہے اور انہیں صحیح تلفظ سکھانے کا فرض ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ دوسروں کو سکھانے اور تربیت دینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنی تربیت خود کریں مگر بقول مشتاق احمد یوسفی، اس کھکیڑ میں کون پڑے۔

اس گفتگو کے بعد پہلا سوال یہ اٹھے گا کہ تربیت کیسے کی جائے۔ غلطیوں سے کیوں کر بچا

جائے۔ اِس کا جواب آسان ہے۔ اپنی تربیت کرنے والا دو کام کرے۔ اوّل یہ کہ سادہ، سہل اور آسان زبان لکھے۔ گفتگو کی زبان سب سے زیادہ سلیس ہوتی ہے، وہی لکھے۔ اجنبی لفظوں پر مشق نہ فرمائے۔ جس لفظ سے کان آشنا نہ ہوں اُن سے بچ کر رہے۔ غلطی کا امکان خود بخود کم ہو جائے گا۔

دوسرے یہ کہ کلاسیکی شاعری پڑھے۔ اساتذہ کا کلام پڑھے۔ یہ کام نثر پڑھنے سے بھی ہو سکتا ہے لیکن لفظ اپنے کھانچے میں کیوں بیٹھتا ہے، یہ گُر شاعری بہتر طور پر سمجھا سکتی ہے۔ ہمارے اساتذہ اس بارے میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔

میر انیس کے مرثیوں سے لے کر جوش صاحب کی یادوں کی برات تک بے شمار تحریریں ہیں جنہیں کچھ لوگ سرسری پڑھتے ہیں لیکن اگر تربیت کے خیال سے توجہ کے ساتھ پڑھا جائے تو تحریر کے بڑے بھید کھلتے ہیں۔

ہمارے ایک ساتھی کو لفظ ''معتدبہ'' لکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ ان ہزاروں الفاظ میں ایک ہے جس سے کان آشنا نہیں۔ اس سے مراد ہے: بہت سا، زیادہ، خاصا۔ اس کا تلفظ دو الفاظ کی طرح ہوتا ہے۔ مُعتَد الگ اور بِہ جدا۔ مگر ہمارے ساتھی اسے ایک ہی سانس میں ادا کر دیتے تھے ''موتادِبہ''

ایک بار کام کے دوران ایک ساتھی نے مجھ سے کسی لفظ کا تلفظ پوچھا۔ میں نے کہا کہ معاف کیجیے، جو لفظ میں بولتا ہی نہیں اس کا تلفظ بھی مجھے نہیں آتا۔

اس معاملے میں ہندی لکھائی کمال کی ہے۔ اس میں زیر زبر پیش کی طرح ماترائیں لگانا لازمی ہے جو لفظ جس طرح لکھا گیا ساری دنیا اُسے اُسی طرح پڑھے گی۔ ہندی فلموں میں کبھی غور کیجیے۔ جس لفظ کو ہم اہل اُردو ''غلطی'' (غل۔طی) پڑھتے ہیں۔ ہندی والے بالکل صحیح یعنی ''غلَطِی'' ادا کرتے ہیں۔

اردو میں کچھ بزرگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تحریر میں زیر زبر پیش ضرور لگاتے تھے۔ اُن میں ایک بڑا نام جوش ملیح آبادی کا ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اردو بولنے والے بچے بچے کا تلفظ صحیح ہو مگر پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ کسی کو کیا پڑی ہے۔ اب تو کیا اخبار اور کیا ریڈیو جہاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا جھٹ انگریزی لفظ رکھ دیتے ہیں مثلاً یہ کہ ''یہ کام چار ورکنگ ڈیز میں مکمل ہو جائے گا۔'' اب سننے یا پڑھنے والا یا تو صبر کا گھونٹ پی کر چپ سادھ لے یا ایک بڑے سے تختے پر لکھے کہ خدا کے لیے اردو بولو اور وہ تختہ لے کر اس اخبار یا ریڈیو کے دفتر کے سامنے کھڑا ہو جائے اور

پولیس والوں کی گھرکیاں سنے۔

اردو کا ایک مسئلہ پیدائشی ہے۔ یہ غریب زبان عربی اور فارسی کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ عربی میں اَدارہ ہے تو فارسی میں اِدارہ۔ میرا عقیدہ ہے کہ اردو میں عربی لفظ براہ راست نہیں بلکہ فارسی کے راستے آئے یعنی پہلے انہیں ایرانیوں نے اختیار کیا وہاں سے وہ شکلیں بدلتے ہوئے ہمارے برصغیر پہنچے۔ الفاظ کی وہی شکلیں مانوس ہیں اور ہمارے نزدیک درست ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ لفظ جب لغت اور کتاب سے نکل کر عوام کے بیچ آتا ہے تو اسے طرح طرح سے برتا جاتا ہے۔ لوگ جیسے مناسب سمجھتے ہیں، اسی طرح ادا کرنے لگتے ہیں اور اگر ان کے تلفظ کو غلط کہا جائے تو وہی غلط تلفظ رواج پاتے پاتے مستند ہو جاتا ہے جسے ذرا ثقیل زبان میں غلط العام کہا جاتا ہے۔

ہمارے بڑے کہہ گئے ہیں کہ اصل لفظ چاہے عربی کا ہو یا فارسی کا، اردو میں آکر اس نے جو شکل اختیار کر لی وہی درست ہے۔ اردو میں آکر نہ صرف تلفظ بلکہ معنی اور مطلب تک بدل جاتے ہیں اور کیوں نہ بدلیں۔ اردو کوئی ہزار سال پرانی زبان تو ہے نہیں۔ یہ تو ابھی بڑی ہو رہی ہے اور نئی شکل نکال رہی ہے۔ رفتہ رفتہ پختہ شباہت اختیار کر لے گی اور اہل زبان اِغوا کو اَغوا اور وَرثہ کو وِرثہ کہنے لگیں گے اور یہی مستند ٹھہرے گا۔ یہ معاملہ ایک اردو ہی کے ساتھ نہیں۔ تمام بڑی زبانوں کے الفاظ وقت اور مقام کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان والے دونوں انگلش بولتے ہیں مگر امریکی انگلش جدا ہے اور برطانیہ کی انگلش جدا۔

عالمِ عرب میں بوتل کو شیشہ کہتے ہیں۔ اہلِ دکن بھی عربی کے زیر اثر بوتل کی بجائے شیشہ ہی کہتے ہیں۔ ہم بھی کسی زمانے میں بڑی بوتل کو شیشہ اور چھوٹی کو شیشی کہتے ہوں گے۔ ہمارے شاعر بھی شیشہ وساغر کی بات کیا کرتے تھے۔ اب لفظ شیشہ تو نکل گیا، شیشی رہ گیا۔ جسے ہم شیشہ کہتے ہیں، عالم عرب اُسے کچھ اور کہتا ہوگا۔

یہ عمل رکنے والا نہیں لیکن جو فکر کا لمحہ ہے، وہ بھی یہی ہے کہ جس لمحہ آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ کیا لفظوں کو وقت، حالات، مقام اور عوام کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے؟ کیا ان کا حلیہ اس حد تک بگڑ جانے دیا جائے کہ انہیں پہچاننا مشکل ہو جائے۔

یہ اندیشے، ذمہ داری کا احساس بڑھاتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ ایک ایک لفظ کی ادائیگی ہی نہیں، پوری زبان کی دیکھ بھال ہو اور اسے سنبھال کر اور سنوار کر رکھا

جائے۔ ہر زبان احترام کی مستحق ہے۔ اس کی شکل نہ بگڑنے پائے اور اس کا حلیہ کہیں مسخ نہ ہو جائے۔ یہ بات غور بھی مانگتی ہے اور توجہ بھی۔

یہاں سوڈیڑھ سو ایسے لفظ اکٹھے کیے گئے ہیں جن کے صحیح تلفظ کے بارے میں کبھی کبھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ لفظ ایسے ہیں کہ بعض لوگ باقاعدگی سے غلط انداز میں ادا کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں ق اور خ کی غلط ادائیگی شامل نہیں۔ کوئی خدا کو کھدا اور قرآن کو کُران کہے تو اسے صرف یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ ذرا سی محنت کر کے صحیح آواز نکالنے کی مشق کرے۔ جب لتا منگیشکر اپنا شین قاف بالکل صاف ادا کر سکتی ہیں تو اردو سے وابستہ لوگ کیوں نہیں کر سکتے۔

تلفظ کے سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ اجنبی لفظوں یا لوگوں یا مقامات کے نام کا ہے۔ امریکی یا یورپین نام کیونکر لکھے جائیں اور کیسے ادا کیے جائیں۔ بعض لوگ ایسے لفظ اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں مگر ان کی ادائیگی میں غلطی ہو سکتی ہے۔ انگریزی حروف میں لکھیں تو بھول چوک کا امکان ہے۔ ہمارے ایک ساتھی جنہیں ہندی حروف کی واقفیت ہے، ایسے اجنبی لفظ ہندی میں لکھ لاتے ہیں (ظاہر ہے اپنی ذاتی سہولت کے لیے) اسے غلط پڑھنے کا خطرہ کم ہے۔ فرانسیسی نام Cardin کا صحیح تلفظ کاروان ہے۔ آپ اسے کیسے لکھیں اور کیونکر ادا کریں گے۔

پاکستان کے ایک خبرنامے میں ایک خاتون نے ghost اسکول کو "گھو۔سَٹ" اسکول پڑھا۔ Grand Prix کو گراں پری کی بجائے گرینڈ پرکس پڑھا جو نہایت معیوب ہے مگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کو خود اپنی تربیت کرنی چاہیے ورنہ بعض نشرگاہیں "گھو۔سٹ" نشرگاہیں کہلائی جائیں گی۔

میں نے جو لفظ یہاں چنے ہیں ان میں زیادہ تر عربی اور فارسی الفاظ ہیں۔ ان کا تلفظ سمجھانے کے لیے میں نے زیر زبر پیش کا استعمال کم سے کم کیا ہے اور انہیں توڑ توڑ کر لکھا ہے۔ کہیں کہیں اردو تلفظ انگریزی حروف میں لکھنا آسان محسوس ہوا۔ یقین ہے یہ حروف سبھی کی دسترس میں ہوں گے۔

آخر میں دوبارہ کہوں گا کہ الفاظ کی اصل شکل اساتذہ کے کلام میں ظاہر ہوتی ہے اور وہی حقیقی سند ہے۔ مثلاً

مے سے غَرَض نشاط ہے کس روسیاہ کو۔ یا

مَرَض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی یا کیا خوب سودا نقد ہے

---------O---------

آخرت: آ۔خِی۔رَت

ابیض: اَب۔یَض (سفید)

اِثناعَشَریہ: اِثنا۔عَشَری۔یَہ (اَثنا غلط ہے)

اِجارہ: زیر سے

اجنبی: اج۔نَ۔بی (اَجن۔بی غلط اجل ہے)

اَخلاق: زبر سے

اِدارہ: زیر سے

اِدغام: زیر سے

اَراکین: ارکان کی جمع

اِردگرد: صرف گرد سے کام چل سکتا ہے

اِرسال: زیر سے

اِزالہ: زیر سے

اُزبک: اُز۔بک

اَزدحام: اژدہام غلط ہے

اَزدَواج: اَز۔دَواج

اَساتِذہ: اسا۔تے۔ذَہ

اُستخواں: اُس۔تُ۔خاں

اِستقلال: اِس۔تق۔لال

اُستوار: اُس۔تُوار

اسپتال: اَس۔پَ۔تال (اَسپ۔تال غلط ہے)

اِسراف: زیر سے

اَسرار: زبر سے

اَسلاف: بزرگ، پرانے لوگ

اَسلحہ: اَس۔لے۔حا (سِلاح کی جمع ہے۔اسلحے کہنا غلط ہے)

اُسلوب: پیش سے

اِسہال: زیر سے

اَش اَش: بعض لوگ عش عش لکھنے لگے ہیں

اِشاعت: زیر سے

اِشتِعال: اِش۔تی۔آل

اَشرَفی: اَش۔رَف۔ی

اُصول: پیش سے

اِضافہ: زیر سے

اِعادہ: زیر سے

اِعانت: زیر سے

اِعتماد: اے۔تی۔ماد

اِغوا: زیر سے

اِفادہ: زیر سے

اَفراتفری: دو زبر

اِفراط: زیر سے

اِفطار: زیر سے

اُفُق: دو پیش

اِفلاس: زیر سے
اَلغَرَض: اَل۔غَ۔رَض
اَلف لَیلہ: alf
انبساط: اِم۔بِی۔ساط
انجیر: اَن۔جیر
ایوان: اے۔وان
بَتول: بَ۔تُول
بُحیرہ: بُو۔حیرا
بَرادر: زبر سے
براہِ کرم: برائے کرم غلط ہے
بَردَہ: زبر سے
بَرف: بَرق کے وزن پر
بزم: عزم کے وزن پر
بقیّہ: بَقی۔یا
بلند: زبر سے
بَوچھار: دہلی والے بوچھاڑ بولتے ہیں
بُہتیرا: بوہ۔تے۔را
بُھرتا: پیش سے
پَرخَچے: پَر۔خَ۔چے
پَریشاں: پرے۔شاں
پَژمُردہ: پَژ۔مُردہ
پشیماں: پشے۔ماں
پُلندا: پیش سے
تشیع: تَشَی۔ع
تدارُک: ت۔دا۔رُک

تعینات: کائنات کے وزن پر
تِفرقہ: تَف۔ری۔قا
تَلَف: تَ۔لَف
تُنک مزاج: تُ۔نک۔مزاج
توَجُّہ: تَ۔وَج۔جُہ
توَسّطُ: تَ۔وَس۔سُط
توَقُّعُ: آخر میں پیش۔ متوقعہِ کے آخر میں زیر
تُہمت: توہ۔مَت
تہنیت: تربیت کے وزن پر
تیَمُّم: تَ۔یَم۔مُم
جِدّ: جِدّ (وجہد = زبر یا پیش سے۔ دونوں صحیح ہیں)
جِدال: زیر سے
جَدَل: جَ۔دَل
چَراغ۔ زبر سے
حَباب: زبر سے
حُجّاج: پیش سے
حُجَم: حَ۔جُ۔م
حُکُومت: حُ کُومت
حَلَف: حَ۔لَف۔
حلفیہ: حَل۔فی۔یا
حَلق: حَل۔ق۔خلق کے وزن پر
خَاطِر: خاطِر
خَبَر: خَ بَر

خَتم: khatm۔خَت۔م
خَجِل: خَ۔جِل
خَلا: زبر سے
خواب: خاب
خواہ: راہ کے وزن پر
خورونوش: خوردونوش غلط ہے
دُوبھر: دُو۔بھر دوبھر بروزن گوہر غلط ہے
دِیَت: دی۔یَت
ذُرِیّت: ذُر۔ری۔یت
رابطہ: را۔بے۔طا
رُوشَناس: رُوشَناس۔رُو۔شَ۔ناس
رِیش: زیر سے
زَخم: زَخ۔م
زَہرہ: نسوانی نام
زُہرَہ: ستارے کا نام
سُرخرو: سُ رخ رُو
سرد مَہری: مَہ۔ری
شَرَف: شَ۔رَف
شِکَست: شِ۔کَست
شِمال: زیر سے
صَاحِب: صا۔حِب
صادِق: صا۔دِق
صادِر: صا۔دِر
صُبح: subh
صَبر: sabr

صِحَّت: صِح۔حَت
صَدر: sadr
صِرف: sirf
صُلح: sulh۔صُل۔ح
ضِمن: zimn۔ضِم۔ن
طَعام: زبر سے
عَصبِیَّت: عَصبی۔یَت
عِصمت: زیر سے
عَطِیّہ: عطی۔یَہ
عُقاب: پیش سے
عِلاوہ: زیر سے
عِیادت: زیر سے
غدر: ghadr
غَرَض: غَ۔رَض
فُحش: پیش سے
فَحاش: زبر سے
فَرش: farsh۔عرش کے وزن پر
فُضول: پیش سے
فِکر: Fikr،ذکر کے وزن پر
قَبول: زبر سے
قُرق: قُ رق
قَضِیّہ: قضی۔یَہ
قَلَق: قَ۔لَق
قمیص: قمیض غلط ہے
قِیاس: زیر سے

قِیام: زیر سے

قِیامت: زیر سے

کالعدم: کل ۔ عَ ۔ دَم

کان کن: کَن = کھودنے والے (مثلاً کوہ کَن)

کدُورت: پیش سے

کش ۔ کُش: کَش = بڑھانا، فروغ دینا + کُش = مارنا، ہلاک کرنا

کفالت: زبر سے

کنارہ: زبر سے

کیفیّت: کیفی ۔ یَت

لاپروا: لاپرواہ غلط ہے

لاحِق: لا ۔ حِق

لُغوی: لُغ ۔ وی

مُتبرّک: مُ ۔ تَ ۔ بَرّک

متّحدہ: مُت ۔ تَ ۔ حِدہ (متحدّہ غلط ہے)

مُتذکِرہ: مُ ۔ تَ ۔ ذَک ۔ کِرہ

مُتصِل: مُت ۔ تَ ۔ صِل

متنازعہ: مُ ۔ تَ ۔ نازَع

مُتوسِّط: مُ ۔ تَ ۔ وَس ۔ سِط

متوکِل: مُ ۔ تَ ۔ وَک ۔ کِل

مُتموّل: مُ ۔ تَ ۔ مو ۔ وِل

مَتن: matn

مُتوجِہ: مُت ۔ وَج ۔ جِہ

مِثل: misl

مُثبَت: مُث ۔ بَت

مُجدَّد: مُ ۔ جد ۔ دد

مَدرِسَہ: مَد ۔ رِ ۔ سَہ

مُدغَم: مُد ۔ غَم

مُذاکرہ: پیش سے

مُرشِد: مُر ۔ شِد

مَرَض: مَ ۔ رَض

مِزاح: زیر سے

مَسرّت: زبر سے

مَشیّت: مَشی ۔ یَت

مُصالحت: پیش سے

مِن وعَن: مِن کے نیچے زیر۔ عَن کے اوپر زبر

مُعنوَن: مُ ۔ عَن ۔ وَن

مَغرِبی: مَغ ۔ رِی ۔ بِی (مَغر ۔ بی غلط ہے)

مُفصَّل: مُ ۔ فَص ۔ صَل

مُقتدِر: مُق ۔ تَ ۔ دِر

مُنتظِر: مُن ۔ تَ ۔ ظِر (انتظار کرنے والے)

منتظَر: مُن ۔ تَ ۔ ظَر ۔ (جس کا انتظار ہو)

مُندرَج: مُن ۔ دَ ۔ رَج (مُن ۔ دَ ۔ رَجہ / ذیل/ بالا)

مُنہدِم: مُن ۔ ہَ ۔ دِم

مُواخذہ: مُ ۔ وا ۔ خَ ۔ ذَہ

مُوجِب: پیش سے

مَورُوثی: مَو۔رُو۔ثی

مُوقِف: مو۔ءَ۔قِف

مَولِد: مَو۔لِد

مُہاجِر: پیش سے

مُہلِک: مُہ۔لِک

مُہمَل: مُہ۔مَل

مِیخ: مے۔خ (میز کے وزن پر)

نادِر: (قادِر کے وزن پر)

نَجات: زبر سے

نَذر: nazr قدر کے وزن پر

نَسَب: غضب کے وزن پر

نَسَق: نَ۔سَق

نَصب: nasb۔ کرب کے وزن پر

نَفس: nafs: جان، روح، ذات

نَفَس: نَ۔فَس: سانس

نَقد: naqd (نَقش کے وزن پر)

نَقل: naql (عَقل کے وزن پر)

نقلِ مکان: نَق۔لِ۔مکان (نقل۔ مکانی غلط ہے)

وُجُود: پیش سے

وَرَق: وَ۔رَق

وَرثہ: زبر سے۔ اب رائج ہے زیر سے

وَزن: wazn۔ وَصل کے وزن پر

ہِراس: زیر سے

ہَضم: بَزم کے وزن پر

ہَوَس: ہَ۔وَس

ہوشرُبا: ہوش۔رُبا (ہو۔شر۔با غلط ہے)

ہَنس، ہَنسی: ہَں س

---------O--------

۹ نومبر ۱۹۵۹ء کی رات کراچی سے اخبار والوں کا قافلہ راولپنڈی پہنچا۔ تصویر میں دائیں سے تیسرے رضا علی عابدی ہیں۔ اسٹیشن پر خیر مقدم کرنے والوں میں بائیں سے پانچویں شوکت تھانوی، میر ناصر مجدد اور سرکار حسن صاحب ہیں۔
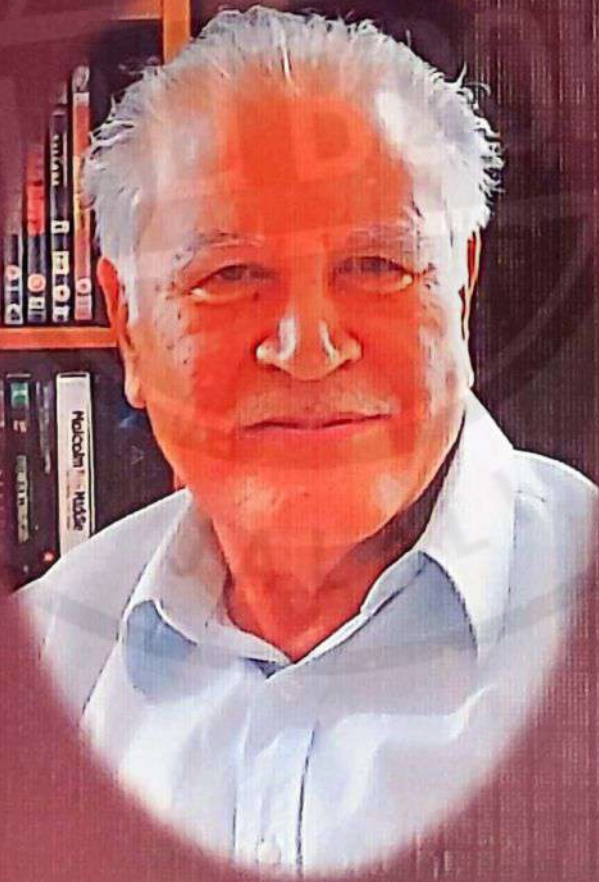
Rs. 600.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2464-0
ISBN-13: 978-969-35-2464-2